اُردُو کا
زِندانی ادب

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی
ڈی لِٹ - پی ایچ ڈی

اُردو کا زندانی ادب
(انیسویں صدی عیسوی میں)

تحقیقی مقالہ

سعادت علی صدیقی
ایم لٹ پی ایچ ڈی
سربراہ شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کالج سنبھل

پیش نظر مجموعہ

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

کے

مالی تعاون سے شائع ہوا

اس کتاب کے مندرجات سے اتر پردیش اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

تقسیم کار:-

اردو گھر - ۷۱، اشفاق اللہ روڈ لکھنؤ - ۱۸
دانش محل، امین آباد پارک، لکھنؤ - ۱۸

فہرست

والد ماجد
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
عم محترم
جناب شفاعت علی صدّیقی
کی نذر

مقالہ نگار ایک نظر میں

نام :- ڈاکٹر سعادت علی صدیقی۔ ولدیت :- ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

سن و جائے پیدائش :- لکھنؤ ۱۵ مارچ ۱۹۴۵ء

تعلیم :- ایم اے (آنرز) فرسٹ ڈویژن لکھنؤ یونیورسٹی، ایم لٹ (اردو) فرسٹ ڈویژن دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر آف فلاسفی (۱۹۸۲) لکھنؤ یونیورسٹی۔

اعزازات :- لکھنؤ یونیورسٹی میرٹ گولڈ میڈل (۱۹۶۵)۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن فیلوشپ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۸ء۔ محسن اردو قومی یک جہتی ایوارڈ مراد آباد کمشنری ۱۹۸۲ء۔ آل انڈیا اردو سماج گولڈ میڈل ۱۹۸۳ء۔

انعامات :- اتر پردیش اردو اکادمی انعام جسیہ غالب (۱۹۷۱ء)۔ اترپردیش اردو اکادمی انعام ادبی جائزے (۱۹۷۶ء)۔ اترپردیش اردو اکادمی انعام ادبی آئینے (۱۹۸۲ء)۔

ملازمت :- شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی عارضی لیکچرر ۱۹۷۰ء، شعبہ اردو روہیل کھنڈ یونیورسٹی لیکچرر ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۴ء۔ ۱۹۸۳ء سے ریڈر گریڈ اور ۱۹۸۶ء سے سلکشن گریڈ۔

مشاغل :- خصوصی رکن حکومت اتر پردیش اردو تعلیمی مشاورتی بورڈ، چیرمین اترپردیش اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی صدر عاشق پبلک لائبریری سنبھل۔ شریک مدیر ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

تصانیف و تالیفات

پیش نظر مقالہ		تصانیف
اردو کا زندانی ادب ۱۹ ویں صدی عیسوی میں		۱. جسیہ غالب مع ترکیب بند
سن اشاعت	۱۹۹۰ء	۲. ادبی جائزے مجموعہ مضامین
تعداد	چھ سو	۳. ادبی آئینے مجموعہ مضامین
ناشر	مصنف	۴. حدیث محبت کلام فرخ نگینوی
کاتب	ابوالکلام دستیر گنج	۵. چند ممتاز شعرائے سنبھل جلد اوّل
مطبع	نامی پریس لکھنؤ	۶. وہ جب یاد آئے (خاکے)
قیمت	پچاس روپئے	۷. بچوں کی لوک کہانیاں
		۸. انتخاب کلام باغ سنبھلی

ترتیب

ابتدائیہ

اردو کو یہ فخر و شرف حاصل ہے کہ اس نے مادرِ وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے ملک کی تمام زبانوں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی نے سب سے پہلے صورِ حریت پھونکا اور غیر ملکی حکمراں، انگریز کی سیاستِ بد کے خلاف آواز اٹھائی، اسی نے ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کے لیے مرنے کی تڑپ پیدا کی، یہ اسی کے سپوت تھے جنھوں نے جدوجہد آزادی میں روح پھونکی، اور قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، ظلم و تشدد کا نشانہ بنے، جو تختۂ دار پر لٹکائے گئے؛ جلاوطن کیے گئے، کالے پانی بھیجے گئے، ہر قسم کی سخت سے سخت مصیبت، اذیت تکلیف اور پریشانی میں مبتلا کیے گئے لیکن مادر وطن کے یہ شیدائی اور آزادی کے متوالے ہمت نہیں ہارے ان کے ہاتھ قلم کیے جاتے رہے مگر وہ حکایات خوں چکاں، لکھنے سے باز نہیں آئے۔

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

اس مقالہ میں انھیں ہاتھ قلم کیے جانے والے سرفروشوں کے سرمایۂ ادب کی تلاش و تحقیق کی گئی ہے جو انیسویں صدی میں ہندوستان اور جزائر انڈمان (کالے پانی) میں جنگِ آزادی (بغاوت) کے جرم میں، اسیرِ فرنگ رہے اور جنھوں نے متاعِ لوح و قلم سے محروم کر دیے جانے کے باوجود، خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر اپنے افکار و خیالات، مشاہدات و تاثرات سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس ادب پر ابھی تک کوئی قابلِ قدر اور خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے اور اسیرانِ فرنگ کے ادبی جواہرات،

کی آب و تاب سے دنیائے ادب پوری طرح واقف نہیں ہے۔ ایسے ان فرنگ کے جواہرات کو فراہم کر کے منظر عام پر لانے کا کام میرے سپرد کیا گیا اور

" اُردو کا زندانی ادب۔ انیسویں صدی میں "

تحقیق کا موضوع قرار دیا گیا۔

موضوع کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر یہ مقالہ حسب ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

زندانی ادب کیا ہے؟ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء سیاسی و سماجی پس منظر اور ادب پر اس کے اثرات۔ جزائر انڈمان میں اسیر شاعر و ادیب۔ حالات و کارنامے۔ ہندستان میں اسیر و شاعر و ادیب۔ حیات و کارنامے۔ اختتامیہ۔

پہلا باب۔ زندانی ادب کیا ہے؟ میں ادب کی تعریف و تشریح ادیبوں کے مختلف مکتبہ ہائے خیال اور مشرقی و مغربی مفکرین اور دانش وروں کے اقوال کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس کے بعد ادب کا انسان، سماج اور نفسیات سے کیا تعلق ہے؟ اور اس سے کیا اثرات اور نتائج مترتب ہوتے ہیں؟ ان پر بحث کرتے ہوئے سماج اور افراد کے حقوق و فرائض کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور قوانین کی تشکیل کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قوانین کا نفاذ ریاست کے اختیار میں ہوتا ہے جو اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے اکثر و بیشتر سماج کے جائز حقوق کو تسلیم نہیں کرتی، یہیں سے سماج اور ریاست میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ حکومت اپنے مخالفین کو کچلنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے اور سزائیں دیتی ہے، زنداں کا وجود اسی وقت سے ہوا۔ ادیبوں اور شاعروں نے حکومت وقت کے جبر و تشدد کے خلاف زبان قلم سے کام لیا، اور اس کے صلہ میں انھیں قید و بند اور دار و رسن کی سزا دی گئی۔ لیکن انھوں نے قید خانوں میں بھی اپنے خون جگر سے کشت فن کی نمود کی ہے یہی نمود، زندانی ادب ہے۔ زندانی ادب کی اصطلاح، اس کی قسمیں اور خصوصیات لکھتے ہوئے، اس کے سماجی اور نفسیاتی پہلو کی وضاحت کر دی ہے۔

دوسرا باب۔ "تحریک آزادی ۱۸۵۷ء سیاسی وسماجی پس منظر اور ادب پر اس کے اثرات" ہے۔ اس باب میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات اور اس کے زوال کے اسباب ونتائج پر بحث کی گئی ہے ان حالات سے اردو ادب کیوں اور کتنا متاثر ہوا، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کس انداز سے کیا' ان کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے افکار وخیالات سے تحریکِ آزادی میں روح پھونک دی۔

تیسرے اور چوتھے باب میں' اسیرانِ فرنگ کے حالات' اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ دونوں باب مقالہ کے اہم باب ہیں۔

تیسرا باب جزائر انڈمان میں اسیر شاعر وادیب۔ حالات اور کارنامے' ہے۔ اس باب میں صرف انھیں شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو بغاوت کے جرم میں سفید فام درندوں نے "حبس دوام بہ عبور دریائے شور" کی سزا دی تھی منیر شکوہ آبادی' مولانا فضل حق خیرآبادی' مفتی عنایت احمد کاکوروی، محمد جعفر تھانیسری' مفتی مظہر کریم دریابادی وغیرہ جیسے یکتائے روزگار مشاہیر اور شمع حریت کے پروانے کالے پانی بھیجے گئے۔ وہاں ان سب کو کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑیں، کون کون سی بیماریوں میں مبتلا ہونا پڑا' ان کی زندگی کے شب وروز کس طرح گزرتے تھے ان سب کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کرنے کے بعد' ان کے ادبی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔

چوتھا باب، ہندوستان میں اسیر شاعر وادیب حیات اور کارنامے، ہے اس باب میں بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ اختر، مرزا غالب مفتی صدرالدین آزردہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ان کی زندگی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پانچواں باب ۔ اختتامیہ ہے۔ یہ باب مقالہ کا ماحصل ہے۔ اس میں زندانی ادب کی اہمیت و افادیت، اس کے خصوصیات اور اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔

اردو ادب میں اس ترتیب و توازن اور شرح و بسط کے ساتھ زندانی ادب اور اس کی خصوصیات پر یہ پہلی کوشش ہے۔ مجھے اپنی علمی بے مائگی اور ادبی بے بضاعتی کے باوجود یہ جرأت ہو رہی ہے کہ میں ادب کے جوہریوں کے سامنے اپنا تحقیقی سرمایہ ـ "اردو کا زندانی ادب انیسویں صدی میں" ـ پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

شرم آید از بضاعت بے قیمتم ولیک
در شہر آبگینہ فروش است جوہری

میری خوش نصیبی تھی کہ اس مقالہ کی تیاری و تکمیل مخدومی و استادی پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب کی شفقت آمیز نگرانی میں ہوئی، جن کی تحقیقی بصیرت، اردو ادب کے لیے منارۂ نور ہے۔

سعادت علی صدیقی
۲۶ر جنوری سنہ ۶۹ء

سربراہ شعبہ اردو
مہاتما گاندھی کالج
سنبھل

باب اول

زندانی ادب کیا ہے؟

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ ہر بات اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ "آپ اس کی کیا تعریف کرتے ہیں؟ اس نقطہ نظر سے کسی بھی شے یا مسئلہ کی ماہیت سمجھنے کے لیے اس کی تعریف کا تعین ضروری ہے۔ تعریف ہمارے مطالعے کے حدود کا تعین کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ کون سے مسائل ہمارے مطالعہ کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ اپنے تجزیے میں ہم کن بنیادی علوم سے مدد لے سکتے ہیں اور تجزیہ کے وہ کون سے طریقے ایسے ہو سکتے ہیں جو ہمارے مطالعے کے لیے مفید ثابت ہوں۔" اسی لیے جان اسٹوارٹ مل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "کسی شے کی ماہیت کو جاننے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے تو اس شے کی حدود کا تعین کریں، اس کے بعد اس کی بعض امتیازی خصوصیات متعین کریں، پھر یہ دیکھیں کہ ان خصوصیات میں کون سی دوسری اشیا اس کی شریک ہیں اور اس بات کا تجزیہ کریں کہ وہ خاص شے دوسری چیزوں سے کیسے ممتاز ہے۔ اگر ہم ان تمام سوالوں کے جواب حل کر لیتے ہیں تو اس خاص شے کی ماہیت جان لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

اگر ہم زندانی ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم زندانی ادب کا تعین کریں۔ زندانی ادب کیا ہے؟ کیا یہ ادب سے علیحدہ کوئی چیز ہے؟ زندانی ادب میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس کو عام ادب سے جدا قرار دیا جا سکتا ہے؟ زندانی ادب اور ادب میں قدر مشترک کیا ہے؟ عمومی طور پر یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات ہم کو زندانی ادب کی ماہیت اور حقیقت جاننے کے لیے درکار ہیں۔ لیکن ان سوالات کا جواب

جاننے کے لیے ہم کو بعض دوسرے مسائل پر بھی غور کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہمیں ادب کے متعلق یہ معلوم کرنا ہوگا کہ

ادب کیا ہے؟

عام طور پر ادب کو انسانی زندگی کی تعبیر، تفسیر، تشریح اور تنقید کہا گیا ہے ادب کی کوئی جامع و مانع تعریف ایسی نہیں ہے جس پر تمام مفکرین متفق ہوں۔ ارسطو کا خیال تھا کہ شعر و ادب ایک طرح کی نقالی ہے جیسے کہ مصوری ایک طرح کی نقالی ہے، یعنی اصل کے مطابق نقل اتارنا۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ادب کی تشکیل کے لیے ایک حقیقی عالم کا وجود ضروری ہے اور جب اس حقیقی عالم کی نقل مصوری میں رنگوں کے ذریعہ یا شاعری اور ادب میں الفاظ کے ذریعہ اتاری جاتی ہے تو اس سے ایک نوع کی حیرت، اور حیرت کے ساتھ خوشی محسوس ہوتی ہے یہ نقل، اصل کے جتنی قریب ہوتی ہے ادب سے حاصل ہونے والے انبساط اور مسرت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔

ادب کے بعض کلاسیکی مفکرین کے خیال میں حسنِ کلام اور حسنِ خیال کا نام ادب ہے۔ اس مکتبۂ خیال کے مفکرین ادب میں، موضوع اور مواد سے زیادہ اہمیت ہیئت اور اسلوب کو دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں کسی تحریر کے ادبی اور غیر ادبی ہونے کا فیصلہ اس کی ہیئت، اسلوب اور تکنیک کی بنا پر ہی کیا جا سکتا ہے۔

مشہور انگریزی ادیب میتھو آرنلڈ کا خیال تھا کہ ادب زندگی کی تنقید ہے۔ اس خیال کے ماننے والوں میں ادیبوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ اس مکتبۂ خیال نے ہیئت کے مقابلے میں موضوع اور مواد کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ادب میں مقصدیت کا ہونا ضروری ہے۔ ادب کا مقصد اپنے سماج کی اصلاح انسانی جذبات و کیفیات کی ترجمانی، انسانیت کا فروغ اور بشریت کی معراج حاصل کرنا ہے۔

اس کے برعکس کروچے کا خیال ہے کہ ادب کسی مقصد کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کا

مقصد محض حصولِ مسرت ہے، خواہ وہ کسی طرح سے ہو۔ اس کو سماج سے، عصری تقاضوں سے اور اس طرح کے دوسرے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا خیال ہے "ادب وہ سخن ہائے گفتنی یا شنیدنی ہیں جو اپنی موضوع کی جدت اور حسنِ بیان کی چمک کے باعث لائق کشش ہوتے ہیں"۔

"ادب نام ہے کسی حقیقت کے حسین ترین اظہار کا۔ ادب ایک چمکتا ہوا سورج ہے جس میں حرارت اور چمک دونوں ہونا ضروری ہیں[1]"۔

بہرحال ادیبوں کے مختلف مکتبہ ہائے خیال نے ادب کی تعریف اپنے اپنے طور پر کی ہے اور انھوں نے ادب کو اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے برتا بھی ہے۔ اپنے نظریات کے مطابق انھوں نے ادب کی تخلیق کی ہے اور انھیں نظریات کے مطابق ادب کے اصول مرتب کیے ہیں، ادبی تحریروں کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا ہے۔ ان مکتبہ ہائے خیال میں بنیادی اور شدید اختلافات بھی ہیں، وہ کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں ہم کو اپنے مطالعہ کے لیے ادب کی کوئی نہ کوئی تعریف تسلیم کرنا ہی پڑے گی کیوں کہ اس کے بغیر شاید کلی طور پر تجزیہ ناممکن ہے اور اس کے لیے بعض مسائل کا تفصیلی مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ادبی مفکرین اور ناقدین کی ایک بڑی تعداد یہ تسلیم کرتی ہے کہ ادب کی تخلیق خلا میں نہیں ہوتی وہ اپنے ماحول، اپنے عہد، اپنے دور اور اپنے سماج کا پروردہ ہوتا ہے، اس لیے ماحول کا اثر، عصری تقاضے، سماج کی شعوری سطح اور بنی نوع انسان کے تمام تجربات کسی نہ کسی شکل میں، ادب کی تخلیق میں شریک ہوتے ہیں۔ ادب کا موضوع خود انسان اور کائنات ہے۔ فلسفہ کے موضوعات بھی یہی ہیں لیکن مسائل کے برتاؤ میں بنیادی فرق ہے۔ فلسفہ کا مقصد حقیقت کا ادراک، انسان و کائنات کے رشتہ کا علم ہے جب کہ ادب کا مقصد حقیقت کا ادراک نہیں، بلکہ صداقت کا اظہار ہے اس

---

[1] ادب کا مقصد ص ۱۲ ۱۹۵۶ء ہندستان کتاب گھر

صداقت یا حقیقت کا فلسفیانہ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ادب کا تعلق ادبی صداقت سے ہے انسانی جذبات کا اظہار اور ان کا ترفع ادب کا اصل مقصد ہے۔

ادب اور سماج

سماج زندہ انسانوں کے مجموعے کا نام ہے جو آپس میں مل کر رہتے ہیں اور مل جل کر ہی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ سماج کسی نہ کسی مقصد کے حصول کی جانب کوشاں رہتا ہے۔ سماج زندہ انسانوں کی ایک تنظیم ہے جس میں بعض افعال و اعمال کو سماج تسلیم کرتا ہے انھیں سے سماجی اقدار کی تشکیل ہوتی ہے۔ ادیب سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ سماج کی اقدار ادیب پر اور اس کے توسط سے ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

سماجی زندگی کسی تالاب کا ٹھہرا ہوا پانی نہیں ہے، اس میں ہمیشہ اتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی در حقیقت دریا کا ایک چڑھتا ہوا دھارا ہے سماجی زندگی کے آتار چڑھاؤ سے ادیب تو کجا کوئی حساس انسان بھی بے گانہ نہیں رہ سکتا۔ سماجی زندگی میں جو ناہمواریاں ہیں ادیب ان سے خام مواد اپنے لیے تلاش کرتا ہے اور یہ تمام چیزیں ادیب کی شخصیت میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔

ادب کا سماج سے جو رشتہ ہے وہ دوہری حیثیت رکھتا ہے۔ ادب سماجی عوامل کا نتیجہ بھی ہے اور سبب بھی۔ سماجی زندگی کی نہج اور اس کی رفتار اس کی سمت ادب کی کیفیت و ماہیت کا تعین کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادب خود بھی سماج کے خد و خال اور اس کی ہیئت پر اثر انداز ہوتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ سماج کو بھی تبدیل کرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک جدلیاتی عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسانی شعور کی تاریخ میں ادب نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ادیب نے ہمیشہ اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کی نہج متعین کرنے کا کام انجام دیا ہے

یہ دوسری بات ہے کہ خود ادب کی نہج اور اس کی رفتار، اجتماعی زندگی سے متعین ہوتی ہے۔ ادیب سماجی ہیئت کی تبدیلی میں ایک نمایاں رول ادا کرتے ہیں وہ ذہنی انقلاب کا ہراول دستہ ہوتے ہیں اور مختلف قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ عوامی بیداری اور شعور کی تربیت میں اس قوم کے اور اس عہد کے ادب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ایام جاہلیت میں عرب ممالک میں شعرا و ادبا اور خطیب اجتماعی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں سرگرم حصہ لیا کرتے تھے ان کے قصیدے اور خطبے نوجوانوں کا لہو گرما تے تھے، انھیں مرنے مارنے پر آمادہ کرتے تھے۔ عربوں کی تاریخ اس قسم کی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ انقلاب فرانس (جس کا ذہنی مبلغ روسو ہے) کے زمانے میں ادیبوں کی باغیانہ تحریروں نے انقلاب کی راہ ہموار کی، روس کے اکتوبر انقلاب سے قبل وہاں کے دلیر ادیب اس زوال پذیر سماج کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے زمین ہموار کر چکے تھے اس سلسلہ میں یہ بات بحث کا موضوع بن سکتی ہے کہ ادب کو ان مقاصد کے لیے استعمال کرنا درست ہے؟ اس کے موافق اور مخالف دونوں قسم کے دلائل دیئے جا سکتے ہیں اور دیئے جاتے ہیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں، ہم تو صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ادب نے دار و رسن کے ان مراحل سے بھی گریز نہیں کیا ہے اور عالمی ادب کی تاریخ میں گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔

شاید اس سے کسی کو اختلاف نہ ہو کہ ادب اپنے سماج کا، اپنے دور کا اور اپنے عہد کا سب سے سچا عکاس ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کارل مارکس کی اس رائے سے بعضوں کو اختلاف ہو کہ ادب، آرٹ اور فنونِ لطیفہ کی تاریخ، ان کی رفتار اور ان کے رجحانات و میلانات اس سماج کے طبقاتی نظام اور معاشی پیداوار کے نظام کا براہ راست نتیجہ ہوتے ہیں، لیکن شاید اس سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہو گا کہ ادب اپنے سماج کے ڈھانچے اور اس میں پائے جانے والے انسانی رشتوں اور اپنے سماجی اقدار اور مجموعی حیثیت سے سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ کسی حد تک ان کی تعمیر، ان کے بننے اور بگڑنے میں بھی حصہ لیتا ہے۔

ادب اور نفسیات

نفسیات یا علم النفس وہ علم ہے جو انسان کی ذات کا مطالعہ کرتا ہے یہ
بات بحث کا موضوع ہو سکتی ہے کہ انسان خود اپنے شعور اور اپنی ذات کا مطالعہ کر سکتا
ہے یا نہیں ؟ اس میں اس کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں ؟ وہ لوگ جو اس کا جواب
نفی میں دیتے ہیں، نفسیات کو ایک برتاؤ پسند Behaveonist رُخ دینے کے
قائل ہیں۔ اور وہ لوگ جو اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں وہ سائنسی نفسیات
کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے نفسیات کے لیے یہ بات ایک مسلمہ یا دلیل
چاہے تو مفروضہ حقیقت کہہ لیجئے کیوں کہ ہر علم کے لیے چند مسلمات یا مفروضات کی
ضرورت پڑتی ہے جن کو بغیر کسی دلیل کے مان کر چلنا پڑتا ہے۔ نفسیات میں ہم شخصیت،
اس کی تشکیل، شخصیت کے بنیادی خدوخال، ذہن، اس کے سرچشمے، شعور، تحت الشعور،
نفسیاتی رجحانات (مادی)، انتشار، مصالحت، انبساط وغیرہ، جذبات وغیرہ کا مطالعہ
کرتے ہیں، نفسیات ایک ایسا علم ہے جو عضویات اور مابعد الطبعیات کا درمیانی
علم ہے۔

ادب کا نفسیات سے گہرا رشتہ ہے کیوں کہ ادب کو ادیب کی شخصیت سے علیحدہ
نہیں کیا جا سکتا۔ ادب میں جو کچھ آتا ہے وہ ادیب کی شخصیت کے توسط سے آتا ہے۔ شخصیت
کے دروں میں یا بیروں میں ہونے کا بہت کچھ اثر ادب کی ماہیت پر بھی پڑتا ہے۔ خود
سماج کے اپنے شعور کی بھی ایک سطح ہوتی ہے جس کا ادب پر اثر انداز ہونا نہایت
ضروری ہے۔ اس طرح نفسیاتی عوامل ادب کی تشکیل میں گہرا حصہ لیتے ہیں۔

سماج اور تمدن

سماج کی تشکیل انسانوں نے اپنی آسانی کے لئے کی تھی۔ سماج کی ابتدا کے بارے
میں دو نظریے خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں، ایک تو نظریہ معاہدہ عمرانی جس کی رو سے
سماج ایک قسم کا معاہدہ ہے جس کو اپنی آسانیوں کے لئے تمام انسانوں نے تسلیم کیا ہے اور

اس طرح اپنے بعض حقوق سماج کے سپرد کر دیئے ہیں۔ دوسرا نظریہ حولیاتی یا ارتقائی نظریہ ہے جس کے مطابق سماج کی تشکیل آہستہ آہستہ اپنے آپ ہوتی ہے۔ اور جیسے جیسے انسانی ضرورتیں مزید پیچیدگیاں اختیار کرتی گئیں اور سماج کی موجودہ ترکیب و ہیئت ان کی اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ نہ ہوئی اجتماعی ضروریات کے پیش نظر اس سماجی ہیئت میں تبدیلیاں ناگزیر ہوتی گئیں۔ اس طرح سے ارتقا کی ایک خاص منزل میں سماج کی تشکیل اپنے آپ ہو گئی ــــــ بہر حال سماج کی تشکیل کسی طرح بھی ہوئی ہو اس کا فیصلہ عمرانیات اور سماجیات کے ماہرین کریں گے یہاں ہمارے لئے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ سماج میں اس سماج کے افراد اپنے بعض حقوق سماج کے سپرد کر دیتے ہیں اور خود ان حقوق کے استعمال سے دست بردار ہو جاتے ہیں اس طرح سے بعض سماجی قوانین کی تشکیل ہوتی ہے جن کو تسلیم کرنا سماج میں شامل تمام افراد کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرد سماج کے قوانین کی پابندی نہیں کرتا ہے تو اس کو سماج کے ذریعہ دی گئی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

زندان کا تعلق سماج سے اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ ریاست سے ہوتا ہے۔ ریاست سماج کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جس میں اس کو اقتدار اعلیٰ بھی حاصل ہوتا ہے۔ زنداں و 'دار و رسن' اس وقت تک جب تک کہ وہ بعض سماجی جرائم کا انسداد کرنے کے لئے استعمال کئے جائیں ایک ضروری برائی خیال کئے جاتے ہیں لیکن اس مسئلہ کا صرف یہی پہلو قابل اعتنا نہیں سماج اور ریاست یا واضح طور پر سماج اور حکومت میں ہمیشہ نظریاتی اتفاق ممکن نہیں ہے بلکہ طبقاتی سماج میں یا خصوصاً عبوری دور میں جب کہ سماج ایک ارتقائی منزل سے دوسری منزل کی طرف قدم بڑھا رہا ہوتا ہے اکثر و بیشتر حکومت کے مقاصد اور سماج کے مقاصد متصادم ہو جاتے ہیں اور ایسے مواقع پر حکومت اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحفظ اور بقا کے لئے 'زنداں' اور 'دار و رسن' کی مدد سے ان نظریات کو کچلنے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے حصول مقاصد میں سدِّ راہ یا برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ارباب حکومت کے مفادات اور سماج یا عام

انسانوں کے مفادات میں اکثر آویزش رہتی ہے۔ ارباب حکومت کو اپنے دورِ اقتدار میں جو گوناگوں آسائشیں اور سہولتیں مہیا ہوتی ہیں انھیں نہ صرف یہ کہ وہ ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کو اپنا دوامی حق سمجھنے لگتے ہیں۔ پھر پیداواری وسائل کی تبدیلی اور عوام کی پیہم جاں فشانی سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اس پر بھی وہ تسلط جمانے اور عوام کو اپنی محنت کے پھل سے اپنے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جبر و بے انصافی کے خلاف اٹھنے والی آواز کو اکثر زنداں میں مقید کیا گیا ہے۔ اسی تضاد کے بطن سے انسانی سماج کے مختلف ادوار میں بغاوت اور سرکشی جنم لیتی رہی ہے۔

انسانی شعور کے ارتقا کی مختلف منزلوں میں آزادی، حریت، آزادیٔ فکر کے چراغ کو روشن رکھنے کی جدوجہد ملتی ہے۔ تاریخ کو پیچھے کی طرف دھکیل لے جانے والے حکمرانوں نے انسانی ضمیر کی آواز پر ہمیشہ تالے ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لئے "زنداں"، "دار و رسن" اور حاکمانہ جبر و تشدد کے دوسرے مظاہر کو اپنے ہتھیاروں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس طرح زنداں کو ایک زبردست سیاسی و سماجی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جمہوری دور میں، کش مکش کے دور میں، سیاسی تسلط کے دور میں، رجعت پرست حکومتوں نے جو ان نظاموں کی طرف دار تھیں، عوام کے شعلۂ آزادی کو بجھانے کے لئے ہمیشہ زنداں کا سہارا لیا ہے۔ ادیب ہر دور میں اپنے دور کا ضمیر، اپنے دور کی آواز رہا ہے۔ آزادیٔ فکر و اظہار کو اس نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔ احساس اور تخیل کی غیر معمولی قوت رکھنے کی وجہ سے اس نے اپنے عہد کی دکھی انسانیت کی جراحتوں اور اذیتوں کو اپنے سینہ میں پوری شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنے احساسات کو قدرتِ بیان سے لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے۔ اگرچہ ضمیر و اظہار کی اس آزادی کے لئے اسے بڑی قیمت دینا پڑی ہے۔ دار و رسن اور قید و بند کی صعوبتیں سہنا پڑی ہیں۔ بہ قول غالبؔ

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ادیبوں نے زنداں کی دیواروں کے پیچھے بھی ادب کی تخلیق کا مقدس اور مبارک

کام جاری رکھا ہے انھوں نے قید تنہائی میں بھی فن کی دیوی کی پرستش کی ہے اس کو جمال و تقدس عطا کیا ہے خون جگر سے کشتِ فن کی نمود کی ہے اس لئے زندانی ادب کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، خصوصی طور پر ان حالات و واقعات کے سیاق و سباق میں جن میں زندانی ادب کی تخلیق ہوئی ہے۔

زندانی ادب

زندانی ادب کی اصطلاح کا اطلاق دو معنوں میں ہو سکتا ہے۔

(۱) وہ ادب جو زنداں میں تحریر کیا گیا۔

(ب) وہ ادب جو زنداں اور اس کے متعلقات کے بارے میں تخلیق ہوا۔

ہم زندانی ادب کی اصطلاح کا استعمال صرف پہلے مفہوم کے مطابق کریں گے کیونکہ وہ ادب جو زنداں اور اس کے متعلقات کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے ہمارے خیال میں زندانی ادب نہیں ہے بلکہ عام ادب کا ہی ایک حصہ ہو سکتا ہے۔ اس میں زنداں کا استعمال اکثر ایک علامت کے طور پر، بلکہ ایک رسم کے طور پر ہوتا ہے خصوصاً اردو شاعری میں زنداں اور اس کے متعلقات کے مضامین پر لاکھوں اشعار آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں لیکن کون نہیں جانتا کہ ان کی حیثیت علامتی اور رسمی ہے کیوں کہ اول تو زنداں کو بھی گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی طرح ایک علامتی حیثیت حاصل تھی دوسرے یہ علامت خود بھی رسمی معنوں میں استعمال کی جاتی رہی۔ اس طرح ان کی اہمیت اور تاثر میں کمی ہی آئی، اضافہ نہیں ہوا۔

لیکن وہ ادب جو زنداں کی سلاخوں کے پیچھے تخلیق ہوا تو ضرور توجہ کا مستحق ہے۔ اس طرح ہم ادب کی دو قسمیں کر سکتے ہیں :۔

(۱) وہ ادب جو معمولی حالات میں لکھا گیا۔

(۲) وہ ادب جو غیر معمولی حالات میں لکھا گیا۔

زندانی ادب دوسری قسم کے تحت آئے گا جس کی تخلیق غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ اور یہ غیر معمولی حالات خارجی اور داخلی دونوں قسم کے ہوتے ہیں کیوں کہ عام طور پر

تو زنداں اور اس کی پابندیاں خارجی تبدیلیاں ہیں لیکن ان کا Impact صرف خارجی نہیں ہوتا بلکہ داخلی بھی ہوتا ہے۔ یہ خارجی تبدیلیاں تو داخلی دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں، انسان کی بے کسی، مجبوری، لاچاری، تنہائی بڑھ جاتی ہے نفسیاتی عوامل اور ان کی کارفرمائی میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اس پر مزید گفتگو آگے آئے گی۔

زندانی ادب کی خصوصیات کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہم کو پتہ چلتا ہے کہ ہم زندانی ادب کی جملہ خصوصیات کا تجزیہ اس طرح کر سکتے ہیں۔

(الف) وہ خصوصیات جو اس زبان کے سارے ادب، اس ملک کی تمام زبانوں کے ادب اور ساری دنیا کے ادب میں ملتی ہیں یا وہ خصوصیات جو کسی بھی تحریر کو ادب کا درجہ دیتی ہیں۔ ان خصوصیات کو ہم ادبیت کہہ سکتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے زندانی ادب بھی ادب کا ایک جزء ہے اگر اس میں ادبیت یا اعلیٰ ادبی عناصر نہیں تو وہ ادب نہیں کہلایا جا سکے گا۔ زندانی تحریروں کے لئے بھی ایک خاص اسلوب، ایک خاص مزاج اور کچھ ادبی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کو ادب کے دائرے میں شامل کیا جا سکے۔

(ب) وہ خصوصیات جن کا تعلق اس زبان کے ایک خاص زمانے کے تمام ادیبوں سے ہے اور اس زمانے کی تمام ادبی تحریروں میں جن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے یہ عصری تقاضے ہوتے ہیں جن سے کوئی حساس ادیب بیگانہ نہیں رہ سکتا۔

(ج) وہ خصوصیات جو کسی خاص ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ انفرادی شخصیت اور اسلوب کی بات ہے۔ جو اس زمانے کے یا اس سے قبل کے کسی ادیب کے یہاں شاذ و نادر ملتی ہیں یہی وہ خصوصیات ہیں جو کسی ادیب کو اپنے عہد اور اپنی زبان کے تمام ادیبوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

(د) وہ خصوصیات جن کا تعلق اس زبان کے سارے ادب سے ہے اور ہر زمانے میں تخلیق کئے جانے والے ادب سے ہے یہ علاقائی خصوصیات ہوتی ہیں، جو کسی دوسرے ملک کے ادب یا کسی دوسرے ملک کے ادب میں نہیں مل سکتی گی۔

(۵) وہ خصوصیات جن کا تعلق صرف ان ادبی تحریروں سے ہے جن کی تخلیق زنداں میں ہوئی۔ جس ادیب نے زنداں کے مصائب جھیل کر اس زندانی ادب کی تخلیق کی ہے خود اس کی تحریروں میں جو معمولی حالات میں لکھی گئی ہیں ان خصوصیات کا موجود ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ خصوصیات ان خارجی اور داخلی تبدیلیوں ذاتی اور انفرادی تجربوں کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں، جن کا تجربہ اسے جیل میں رہ کر ہوا ہے۔

یہ صرف پانچویں خصوصیت ہے جو زندانی ادب کو ادب سے علیحدہ کرتی ہے جہاں تک دوسری تمام ادبی خصوصیات کا سوال ہے 'زندانی ادب' ادب سے چنداں جدا نہیں ہوتا لیکن زندانی ادب کی تڑپتی ہوئی روح، اس کا اندرونی مزاج کیفیت، اثرا در تاثر میں اس کے جداگانہ کی چڑھاؤ ان خارجی و داخلی حالات کے جدا ہونے کی دلالت کرتے ہیں، جن میں زندانی ادب کی تخلیق ہوئی ہے۔

زندانی ادب کے دو پہلو :—

زندانی ادب کے بارے میں ان ابتدائی باتوں کے جان لینے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ادب کے دو مزید پہلوؤں کا خصوصیت سے مطالعہ کریں۔

(۱) سماجی پہلو

(۲) نفسیاتی پہلو

بہتر ہوگا کہ ہم ان دونوں پہلوؤں پر الگ الگ غور کریں، اور ان پر روشنی ڈالیں۔

سماجی پہلو

زندانی ادب کا سماجی پہلو اس بات پر منحصر ہے کہ شاعر یا ادیب کو کس جرم کے تحت زنداں میں بھیجا گیا ہے؟ وہ کون سے محرکات ہیں جنہوں نے ادیب کو موجودہ سماجی توازن، موجودہ سماجی نظام سے بغاوت کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ وہ کہاں تک اس سلسلہ میں آگے جا سکتا ہے؟ اس کا مطمح نظر کیا ہے؟ اعلیٰ اخلاقی اور انسانی قدریں اس کی نظر میں ہیں یا نہیں ___؟ یہ تمام باتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ بعض دوسرے سماجی محرکات پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ زندانی زندگی بسر کرکے ادیب ایک طرح کی

قربانی دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے سیاسی یا سماجی محرکات ہیں جو اس ادیب پر اثرانداز ہوئے اگر سیاسی محرکات ہیں تو ان کی جہت اور سمت کیا ہے؟ ان کا دھارا رجعت کی جانب ہے یا ترقی کی طرف۔ خود سماج میں ہلچل، اتھل پتھل، اجتماعی زندگی کی حرکت کا عالم کیا ہے؟ ان سے ادیب کو زنداں میں کسی قسم کا وجدان ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ تمام باتیں اپنی جگہ بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کیوں کہ زندانی ادب کی تخلیق اور اس کی قدر و قیمت کا تعین انھیں باتوں پر منحصر ہے۔

نفسیاتی پہلو

جیل خانہ کی زندگی ایک عجیب زندگی ہے اس زندگی میں زندانیوں کا رابطہ عام انسانوں سے اور سارے سماج سے کٹ جاتا ہے۔ یہاں زنداں کی ناقابل عبور بلند چہار دیواری، اس چہار دیواری کے اندر قیدیوں کے رہنے کے لئے بارکیں، تنہائی کی کوٹھریاں، پھانسی گارد۔ بے رنگ ماحول کچھ جانے پہچانے، کچھ اجنبی چہرے یہاں کے نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ایک لمبا چوڑا اسٹاف، جو جیلر، ڈپٹی جیلر، وارڈن، ہیڈ وارڈن، پکا اور جمعدار وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ پودوں درختوں اور پرندوں کا وجود، یہ وہ جانے پہچانے مناظر ہیں جو ہم نشینی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اس ماحول میں بیڑیوں کی جھنکار، جو لطف دیتی ہے، اس کو ایک زندانی ہی محسوس کر سکتا ہے، جیل کے زیورون میں ہتھکڑی، کھڑی ہتھکڑی، الٹی ہتھکڑی اور آڑا بیڑا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قدم قدم پر گنتی اور پریڈ، سونے کے لئے بجنے پلنگ کے کھڈیاں، بچھانے کے لئے موج کے پھٹے، اوڑھنے کے لئے کمبل۔ یہ صورتحال ذہنی اور نفسیاتی طور پر زندانیوں پر جو اثرات ڈالتی ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس سے عدم توازن کے امکانات کی موجودگی کا پتا چل جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں انسان کیسی کیسی پناہیں ڈھونڈتا ہے؟ کیسے رفیق بناتا ہے؟ اپنا وقت کیسے گزارتا ہے؟ کن لوگوں کو یاد کرتا ہے؟ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ماحول میں تنہائی پسندی، دنیا سے بے زاری، خودکشی، اذیت پسندی جیسے مریضانہ جذبات بھی انسان پر غلبہ

پاتے ہیں، زندانی ادب کی تحلیل نفسی اس نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے کہ تحت الشعور یا لاشعور میں یہ جذبات کام تو نہیں کر رہے ہیں، خصوصاً ایک فن کار اور ادیب کے لئے قید و بند کا تجربہ عام انسانوں سے زیادہ نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ زیادہ سریع الحس ہوتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے یہ بات بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے کہ زندانی ادب کی تخلیق کے لئے کن موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ موضوعات کے انتخاب، نفس مضمون، مواد سے بہت کچھ ادیب کی اپنی ذہنی ساخت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے زندانی ادب کا نفسیاتی پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔

یہ ایک سرسری خاکہ ہے ان عام اصولوں کا جن کی روشنی میں زندانی ادب کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

آئندہ اوراق میں "۱۹ ویں صدی میں زندانی ادب" کا مطالعہ انہیں اصولوں کی روشنی میں کیا جائے گا۔
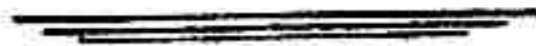
باب دوم

تحریک آزادی ۱۸۵۷ء

سیاسی و سماجی پس منظر اور ادب پر اس کے اثرات

۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغل کی سلطنت لال قلعہ تک محدود تھی، بس ایک وقار تھا جس کو لوگ ورثہ میں ملے ہوئے سرمایے کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھے، ملک کے ایک بڑے طبقہ نے انگریزی حکومت کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر گوارا کر لیا تھا۔ بڑے بڑے صاحبانِ علم و کمال انگریزی ملازمت کے اعلیٰ اعزاز سے سرفراز تھے۔ گویا حالات و واقعات کی رفتار شکست و ریخت کے بعد ایک نقطہ پر آ کر رک سی گئی تھی۔ قدیم نظام کے ٹوٹنے اور نئے نظام کی آمد سے تہذیبی اور سماجی اقدار میں تغیرات ہونا لازمی بات تھی۔ درباروں کی وسعتیں ہزاروں پڑھے لکھے افراد کی کفیل تھیں، نئے نظام میں علم و ادب کے یہ سارے سہارے جاتے رہے تھے۔ شکست و ریخت کے اس بنیادی عمل سے جہاں معاشرت میں انتشار اور بے چینی پھیل گئی تھی وہاں شعرا کے قلب و ذہن خاص طور پر آماجگاہ رنج و الم تھے۔ شعر نوازی اور علم دوستی کی وہ فضائیں ختم ہو گئی تھیں جن میں شعرا کی تخلیقی صلاحیتیں بارآور ہوتی ہیں۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد دورِ حکومت میں اضمحلال کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے نادان جانشینوں کی باہم گریباں گیریوں نے اس کو مکمل بھی کر دیا تھا۔ زندگی کے جو محرکات، شاہی وقار کے زیر سایہ سمٹے سمٹائے جا رہے تھے، ابھر کر سامنے آ گئے، انتشار اور بدنظمی کی دراز دستیوں نے متوسط اور محفوظ طبقہ کی سکون و سامانیاں بھی چھین لیں۔ دہلی، اسلامی ہند کی ابتدا

سے تمدن و تہذیب کا اعلیٰ نمونہ رہی ہے، دجلہ و فرات سے علم و ہنر کے جو دریا بہے وہ جمنا کے کناروں سے آکر ٹکراتے تھے، بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے وہ یہیں آکر ٹھہرے تھے۔ کبھی اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں، قدم قدم پر مدرسے تھے، کوچہ کوچہ میں مساجد تھیں، تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے بڑی سے بڑی تکلیفیں برداشت کر کے یہاں آتے تھے اور ہندستان کا مایہ ناز دار السلطنت جنت نشان بنا ہوا تھا۔

دہلی ہزار بار اجڑی، ہزار بار بسی ہے، اس نے سیکڑوں طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے، جو آندھی اٹھی سینہ سپر ہو کر اسے برداشت کیا لیکن تمام مصیبتوں کے باوجود دہلی اس وقت بھی بارونق تھی، جب سلطنتِ مغلیہ چراغِ سحری، ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ نقوش باقی تھے، جن سے کاروانِ رفتہ کی عظمت و شوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان نقوش کی موجودگی نے دہلی کو تمام ممالکِ اسلامیہ کی نگاہوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے معتقدین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکے تھے، اور علوم دین کی اشاعت کر رہے تھے۔ اور آنے والے عبرت خیز دور کی نشان دہی بھی کر رہے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے عہد میں حضرت سید احمد شہید حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی کے دوروں نے پورے ہندستان، بالخصوص شمالی ہند میں جذبۂ انقلاب کے جو شعلے بھڑکا دیے تھے وہ خونِ شہادت کی چھینٹوں سے سرد ہونے والے نہ تھے، یہ زمزمہ لاکھوں دلوں کو گرما چکا تھا۔ اور بہ قول ہنٹر ــــــ
"یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی"۔

شہیدانِ بالاکوٹ کا خون ابھی جمنے نہ پایا تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ سندھیا ڑ میں جمع ہوا اور سرنگوں جھنڈے کو دوبارہ بلند کیا۔ جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک لہراتا رہا۔ مختصر یہ کہ ہجرت، جہاد اور شہادت کی جو رسم سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جاری کی تھی وہ ایک لمحہ کے لئے بھی موقوف نہیں ہوئی۔ ان کے علاوہ بے شمار محبانِ وطن اور فدا کارانِ حریت وہ تھے جو اگرچہ ترکِ وطن کر کے محاذ پر نہیں

جاسکے تھے مگر ان کی نیک تمنائیں اور دلی ہمدردیاں مجاہدین کی معاون رہی تھیں۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد تحریک کے دو مرکز ہو گئے۔ دہلی کا پرانا مرکز نئے رجحانات کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور صادق پور پٹنہ کے نئے مرکز نے پرانی راہ ورسم کی تقلید کی۔

دہلی کے مرکز نے انقلاب کے لئے وہ شاہ راہ اختیار کی جو ہندو مسلمانوں کے مشترک اور متحدہ محاذ کی اساس بنی۔ جو تقریباً پچاس سال بعد انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی مقصد قرار پائی۔ اور مرکز صادق پور کا لائحہ عمل وہی رہا جو سید صاحب نے قائم کیا تھا۔ یعنی ہجرت، جہاد اور تن من کی قربانی۔ صادق پور مرکز کے بانی مولانا ولایت علی تھے۔ اسی زمانہ میں سید صاحب حج کو گئے تھے۔ مولانا ولایت علی درسیات سے فارغ ہو کر لکھنؤ سے پٹنہ آئے اور ایک مرکز قائم کر دیا۔ بہ قول مصنف سوانح احمدی:

"مولانا (ولایت علی) نے اسی وقت سے جمعہ اور جماعت اپنے یہاں قائم کر کے وعظ و نصیحت شروع کر دی۔" عوام کی اکثریت نے مولانا کے وعظ اور نصیحت پر لبیک کہا اور تحریک میں جان پڑ گئی۔ ان لوگوں نے ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کیں، دکھ جھیلے، جنگیں لڑیں، مصیبتیں اٹھائیں، گرفتار ہوئے لیکن اس مقصد کو پورا کرنے میں جان کی بازی لگائے رہے جو تحریک ولی اللہ کے بنیادی مقاصد تھے۔

سلطنت مغلیہ زوال پذیر تھی، سیاسی پستی آخری منزلیں طے کر رہی تھی۔ لیکن ذہنی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ صاحب نظر اور ذکی الحس انسان تجدید و احیاء کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے، معاشرے کی پریشاں حالی نے شعراء کی ذاتی کس مپرسیوں سے مل کر شاعرانہ محشر طرازیوں کے لئے خاصا سامان فراہم کر دیا تھا۔ جن شعراء کا انتقال غدر سے قبل ہو چکا تھا ان کے یہاں مسدس، شہر آشوب یا متفرق قطعات و مثنویات کی صورت میں اس کی ترجمانیاں ملتی ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"اٹھارہویں صدی عیسوی صرف ہندستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں

بڑی اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ کچھ ملک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے، کچھ ایسے بھی تھے جن کی گردن میں غلامی کے طوق ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کامیاب طور پر لڑی جا چکی تھی۔ انقلاب فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی تحریکوں کو ابھار دیا تھا۔ پرانا سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ لیکن عالم اسلام کی حالت بالکل مختلف تھی۔ وہاں عام رجحان پستی اور تنزل کی جانب تھا۔ ایک طرف دولت عثمانیہ کا آفتاب اقبال تیزی کے ساتھ گہن میں آرہا تھا، دوسری طرف ایران میں انتشار و ابتری کا دور دورہ تھا۔ ادھر مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی، نئی نئی قوتیں ابھر کر سیاسی فضا کو مکدر کر رہی تھیں، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست اور سماج کی بنیادیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہل جائیں گی۔...[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ان حالات میں ناگزیر ہو گیا تھا کہ ملک کے وہ تمام عناصر جو تھوڑی سی قوت جمع کر سکتے ہوں قسمت آزمائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ سکھ، مرہٹے، روہیلے، جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامہ آرائی کی اور حالات کو اس درجہ خراب کر دیا کہ امن و سکون ملک سے مستقل طور پر رخصت ہو گیا۔ فتنہ و فساد، منافرت و عداوت، لوٹ مار اور غارت گری نے سماجی زندگی کا نام و نشان بھی نہ چھوڑا ___[2]

ہندوستان کے بڑے علاقہ پر تسلط اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد جب انگریزوں کے سامراجی مقاصد کا تعین ہو گیا تو ان کے حصول اور استحکام حکومت کے لئے انھوں نے جو ریشہ دوانیاں کیں، ان میں سے ایک ہندوستانی عوام میں نفاق اور نفرت کو ہوا دینا بھی تھا۔ مسز اینی بیسنٹ لکھتی ہیں:

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۰۹، ۳۱۰۔ [2] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۱۳

"کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ تاجروں کی جنگ تھی۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار کے زور سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے اور رشوت و سازش، نفاق اور حد درجہ کی وودرخی پالیسی پر عمل کر کے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر کے اسے یہ ملک حاصل ہوا۔"[1]

انگریزوں کی، تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو، کی پالیسی کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شکوک، نفرت اور بیزاری کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ چنانچہ سر جان مینارڈ جو کبھی پنجاب ایگزیکیٹو کونسل کا سینئر ممبر رہ چکا تھا لندن کے ایک جریدہ موسومہ 'معاملات خارجیہ' میں ہندوستان کے حالات کی عکاسی اس طرح کرتا ہے:

"ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف عام رجحان موجود ہے، جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمان کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ برطانیہ سے پہلے بھی ظالم سلاطین گزر چکے ہیں جنھوں نے کبھی غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور کبھی گائے ذبح کرنے پر مجنونانہ جوش میں سزائیں دیں۔ لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا اور خواہ ہندو ہو یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف پرستش رہتے تھے۔"[2]

سر جان سیلکم کا یہ قول بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے.....

"اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عمل داری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس

---

[1] بحوالہ روشن مستقبل ص ۴۹۔ [2] ماخوذ از: ان ہیپی انڈیا۔ لالہ لاجپت رائے بحوالہ حکومت خود اختیاری ص ۵۲

طرح سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوت کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔"[1]

انگریزوں نے ملک میں جس طریق تعلیم کی بنیاد ڈالی تھی اس کی نوعیت کا اندازہ لارڈ میکالے کے اس مشہور بیان سے جا سکتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ اس تعلیم کے نتیجہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہونی چاہیے جو خون و رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو لیکن مذاق اور رائے الفاظ اور فہم کے اعتبار سے انگریز ہو۔ اس کوشش کے پس پردہ دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کی نئی تعلیم یافتہ جماعت اپنے وطن کے کروڑوں عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے دور ہو جائے اور برطانوی حکومت کی وفادار بن کر رہ جائے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے اس طریق تعلیم کے جو الم ناک نتائج سامنے آ رہے تھے اس کے ثبوت میں اس یادداشت کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جو ۱۸۲۳ء میں آنریبل ایم ایلفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے حکومت کو پیش کی تھی:

" انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے سرچشمے خشک کر دیئے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیئے، بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار اور فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس الزام کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔"[2]

اس ہلاک نظام تعلیم کے دوش بدوش عیسائی مشنریوں کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو ایک بڑے منصوبے اور تنظیم کے ساتھ شمال سے جنوب تک ہندوستانیوں کو عیسائیت کی تعلیم دے کر انھیں اپنے مذاہب اور کلچر سے بیگانہ اور متنفر کر رہی تھیں

---

[1] کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم از میجر باسو ص ۸۰، (بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۶۰ طبع سوم)

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۳۲

اور کمپنی کی حکومت اور اس کے اراکین اپنے سیاسی مقاصد کے لئے ان مشنریوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کے دار العوام میں کی گئی تقریر نے اس مہم تبلیغ کو ہوا دینے میں بڑا اثر کیا۔ مسٹر مینگلس نے کہا تھا۔۔۔

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرنگیں آگئی ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہ کرنا چاہیے۔"[1]

یہی وجوہ ہیں کہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی اکثریت صرف ۱۸۵۷ء تک نہیں بلکہ اس کے بعد بھی انگریزی تعلیم سے بیزار اور برہم رہی۔ اس کے نتیجہ میں انھیں انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ انھیں حکومت کی ظاہری برکات سے اور عہدوں سے محروم رکھا گیا۔

ولیم ہنٹر کا بیان ہے:

"اپنی عمل داری کے اول ۷۵ سال میں یعنی ۱۸۳۲ء تک ہم نے اپنے انتظامی عہدے دار تیار کرنے کے لئے مسلمانوں کے اسی سابقہ نظام تعلیم کو جاری رکھا۔ اس دوران ہم نے اپنا سلسلۂ تعلیم قائم کر دیا تھا اور جوں ہی اس سے ایک نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھا کر پھینک دیا جس نے مسلمانوں کی ملازمت کے عام راستے بند کر دیے۔"[2]

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بقول ہنٹر۔۔۔

۱۔ از حکومت خود اختیاری بحوالہ علماء حق ص ۲۷، ۲۶ سید محمد میاں۔

۲۔ مسلمانوں کے افلاس کا علاج۔ منجانب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۴ء ص ۷

دو ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں
بجز چپراسی یا چھٹی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی نوکری مل سکے"[1]

سیاسی اعتبار سے انھیں بے دست وپا بنانے معاشی اعتبار سے انھیں اپنا دست نگیر کرنے اور مذہبی اعتبار سے ان کے دین اور عقائد کو بدلنے کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کا احساس خود انگریزوں کو بھی تھا۔ چنانچہ ہنری ہیبر نگٹن طامس نے اپنے رسالہ "ہندوستان میں گزشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی" میں صاف لکھا ہے:

"میں نے پہلے ہی بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود رہیں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہیں کر سکتے تھے اور نہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ (مسلمان) خلیفہ اول کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ متعصب اور ظالم رہے ہیں۔ ہمیشہ ان کا مقصد یہی رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشوونما ہو۔ مسلمان ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس بیان میں جزوی صداقت ہے اور حقیقت کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے جہاں ہم پر اور بہت سے ستم کئے وہاں سب سے بڑا ستم یہ بھی تھا کہ ہمیں صحیح طور سے سوچنے سے محروم کر دیا،

---

[1] مسلمانوں کے افلاس کا علاج۔ ص ۹

ذہنوں پر پہرے بٹھا دیے۔ فکر و خیال کو بیڑیاں پہنا دیں، اور عقل و شعور کو پابہ زنجیر کر دیا چنانچہ اس ڈیڑھ سو سال کی حکومت میں برابر ان کی یہی کوشش رہی کہ صرف ان کی سی باتیں کہی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خود ان خیالات کو پھیلاتے رہے جن سے ہماری نفی ہوتی تھی۔ ہم نے خود ان تصورات کو عام کیا جو ہمارے وجود کو کھوکھلا کرتے رہتے تھے۔ اور اس طرح انگریز کا مقصد پورا ہو گیا۔

۱۸۵۷ء میں پہلی بار غیر ملکی حکمرانوں کو اس مقدس سرزمین سے باہر نکالنے کے لئے عملی قدم اٹھایا گیا۔ اس ملک کے باشندے ایک مرکز پر جمع ہوئے اور فوجوں نے سر سے کفن باندھ کر جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو مسلم کی تفریق مٹ گئی، ہندوستانی عوام جان ہتھیلی پر لئے میدان میں آ گئے۔ خون بہا۔ گھمسان کا رن پڑا لیکن انگریزوں نے اس جنگ کو غدر سے تعبیر کیا اور اس کو فوجی بغاوت کا روپ دینے کی کوشش کی۔ اگر چہ اس مقدس جنگ کو غدر سے تعبیر کرنا آزادی اور انقلاب کے تصورات کی توہین کرنا ہے۔ یہ جنگ عظیم مقصد کے تحت لڑی گئی تھی۔ اس میں شریک ہونے والوں میں سے ایک بھی ذاتی مفاد کے لئے نہیں لڑا تھا۔ سب ایک اجتماعی مفاد کے لئے میدان میں آئے تھے اور ان کے پیش نظر ملک کی آزادی تھی، قوم کا مفاد تھا اور عوام کی بہتری تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا وہ اس بے سر و سامان کے عالم میں ہوا کہ اس میں کوئی تنظیم نہیں تھی، کوئی ضبط و نظم نہیں تھا۔ بلکہ ایک طوفان کی سی کیفیت تھی۔ انقلاب کا یہی انداز ہوتا ہے۔ آزادی کے لئے لڑی جانے والی جنگیں اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی جس کو غدر کا نام دیا جاتا ہے انقلاب کی ایک ناکام کوشش تھی، آزادی کی ایک جنگ تھی جس میں بعض اسباب کی بنا پر ناکامیابی ہوئی۔ انقلاب اور آزادی کے لئے جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں ان کی ناکامیابی میں بھی ایک طرح کی کامیابی پوشیدہ ہوتی ہے کیوں کہ ناکامی کا احساس ہی آئندہ نسلوں کے دلوں میں جوش و ولولے کی جوت جگاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد بھی یہی ہوا۔ اس ناکامی کے بعد بھی آزادی کی جدوجہد جاری رہی وہی۔ ہندوستانی مجاہد کبھی چین سے نہ بیٹھے جنگ کی صورتیں بدلتی رہیں مگر جنگ کا خاتمہ نہ ہوا ـــــ تین چوتھائی صدی اسی طرح بیت گئی اور ہندوستانیوں نے اسی وقت دم لیا جب اس مقدس سرزمین سے ظالم کے پیر اکھاڑ پھینکے۔

ہر انقلاب میں ایک انتہا پسندی بھی ہوتی ہے۔ یہ انتہا پسندی اس انقلاب میں بھی تھی اس میں شک نہیں کہ انقلابیوں سے کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں لیکن اس انتہا پسندی میں بربریت نہیں ہے۔ انگریزوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے (جس کی مثالیں پہلے دی جا چکی ہیں) وہ بڑی حد تک دروغ اور افترا ہے۔ اول تو انھوں نے دروغ بیانی سے کام لیا ہے دوسرے وہ اس حقیقت کو بھی جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جو نفرت انھوں نے اپنے طرز عمل سے ہندوستانی عوام میں پھیلائی تھی اس نے کہیں کہیں مجاہدین آزادی کو غلط راستوں پر لا کھڑا کیا۔ انگریز تاجروں کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اور یہاں بادشاہ بن بیٹھنے کے خواب دیکھنے لگے تھے چنانچہ اسی ہوس کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے دست درازیاں کیں۔ بنگال کے سراج الدولہ کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا، میسور میں حیدر علی، ٹیپو سلطان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، دلی میں شاہ عالم اور دوسرے مغل فرماں رواؤں کے ساتھ جو کچھ ہوا، اودھ میں واجد علی شاہ پر جو بیتی اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں ذرا مشکل سے ملیں گی۔ ملک گیری کی ہوس نے انگریزوں سے وہ سب کچھ کرایا جس کے بارے میں سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی عوام ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ ان واقعات نے ان کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے کبھی نہ ختم ہونے والا جذبہ نفرت پیدا کر دیا تھا اور وہ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ صرف انھیں مناسب وقت کا انتظار تھا ـــ یہ مناسب وقت ۱۸۵۷ء کی صورت میں سامنے آیا۔ جب ہندوستانی فوجوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ـــ انگریز اسے مذہبی رنگ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے

یہی کہ یہ صرف کارتوسوں کا مسئلہ تھا جن کو ہندو یہ سمجھ کر کہ ان میں گائے کی چربی ہے اور مسلمان یہ جان کر کہ ان میں سور کی چربی ہے، استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے بغاوت کر دی۔ بغاوتیں اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتیں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انقلاب نہیں آیا کرتے۔ ہندوستانیوں نے بغاوت اس لئے کی تھی کہ انھیں اپنی غلامی کا احساس ہو گیا تھا وہ اس سرزمین پر انگریزوں کا حق نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اپنی آزاد حکومت چاہتے تھے۔ بغاوت کے اسباب میں ان کے بادشاہوں کے ساتھ انگریزوں کا ظالمانہ سلوک اور ہندوستانی معیشت کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے تباہ کن منصوبہ بھی تھا۔ اس انقلاب میں محض ہندوستانی فوج شامل نہیں تھی اس میں عوام بھی شریک تھے۔ عوام کے ہر شعبہ کے افراد شامل تھے۔ سب کے پاس بندوقیں اور تلواریں ہی نہیں تھیں۔ جو جس کے ہاتھ میں آیا اسی کو لے کر لڑنے کے لئے باہر نکل آیا۔ یہ سب کچھ ایک بامقصد انقلاب ہی کے لئے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے لڑنے والوں میں تنظیم کیسے ہو سکتی تھی پھر بھی انھوں نے اپنی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے امکان بھر منظم ہونے کی کوشش کی۔ بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کیا گیا اودھ میں واجد علی شاہ کے جانشین کو اسی خیال سے تخت نشین کیا گیا۔ ظفر، جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپی، نانا صاحب، حضرت محل، بموخاں، احمد اللہ شاہ، خان بہادر خاں، اور ایسے ہی کتنے اشخاص تھے جن کی قیادت میں یہ جنگ لڑی گئی کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہو گئے اور انھیں یہ یقین ہو گیا کہ بس اب ان کا آخری وقت آ گیا ہے لیکن آخر میں اپنی سیاسی چالوں کی بدولت انھیں کامیابی ہوئی۔ کچھ فوجی دستوں نے غداری کی۔ دلی کا ختم ہونا سرفروشوں کے لئے سم قاتل بن گیا۔ اس حادثے نے ان کی کمر توڑ دی۔ پھر بھی مختلف علاقوں میں یہ جد وجہد جاری رہی اور جنگ بظاہر ختم ہونے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی۔

...... مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریز اس انقلاب کو وقتی طور پر دبانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کے بعد انھوں نے جس درندگی، بہیمیت اور بربریت کا ثبوت دیا

دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لاکھوں انسان گولی کا نشانہ بنے، ہزاروں پھانسی پر لٹکائے گئے، شہزادوں کے سروں کو کاٹا گیا اور فاقہ کے مارے باپ کو بھیجا گیا اور اس طرح کی لاتعداد مثالوں سے انگریزوں کی ظالمانہ خصلت کا ثبوت ملتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ جنھوں نے اپنے ملک کے ساتھ غداری کی، انھیں نوازا گیا انعامات و نوازشات کی بارش ہوئی۔۔ اس کی تفصیل ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ کا بدنما داغ ہے۔

"۱۸۵۷ء کے حادثہ سے قبل بھی معاشرتی و ذہنی پریشانیوں کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی اس دور میں زندگی اور وسائل زندگی کی تقسیم کچھ اس طرح سے تھی کہ شخصیت اور ذہانت مختلف حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ عوام ہمیشہ سے ایک معیار زندگی کے عادی تھے، بادشاہت کے بدلنے یا نظام حکومت کے تبدیل ہونے سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، البتہ شعرا کا طبقہ اس سے براہ راست متاثر ہوتا تھا۔ اس کی ذہانت و قوت فکر ایک مخصوص دردل بینی اور عشق کوشی کے عناصر سے تشکیل رہتی تھی۔ اس کی تخلیق اور نشو ونماہی ان فضاؤں میں ہوتی تھی البتہ شکم سیری اور تن پوشی کے نقطہ پر آ کر وہ محو اضطراب ہو جاتا تھا کیوں کہ زمانہ ساتھ نہیں دیتا تھا لیکن ذہنی نشو ونما کے بنیادی اثرات جلد ہی پھر اسے تصورات کی دنیا میں محو سفر کر دیتے تھے، جس سے شعری تخلیقات کے چہرے پر ساری بے سروسامانی کے باوصف عشق و تصوف کا رنگ نظر آتا تھا لیکن انقلاب کی اس جنگ نے ادب پر بھی اپنے اثرات چھوڑے۔ اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ ہر چند کہ اس موضوع پر کوئی اہم شعری تخلیق نظر نہیں آتی جس میں عظمت ہو اور جو اس پر آشوب دور کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہو اس کا سبب یہ ہے کہ اس ہنگامے نے شاعروں کو مبہوت کر کے رکھ دیا خصوصیت کے ساتھ انگریزوں نے جو زیادتیاں کیں، ظلم و استبداد کا جو بازار گرم کیا اس کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے، اور اس کے بارے میں اظہار خیال کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ انگریزوں نے شاعروں اور ادیبوں کی زبانوں پر

تالے ڈال دیے انھیں حقیقت کے اظہار کا موقع حاصل نہ تھا۔ حق گوئی کے لئے پھانسی کا پھندا منتظر رہتا تھا۔ ماحول پر دہشت طاری تھی۔ مصلحت پسندی نے شاعروں اور ادیبوں کو خاموش رکھا لیکن مختلف شعرا و ادبا کے یہاں اس کی جھلک ضرور مل جاتی ہے۔ اور ان کی تخلیقی کاوش سے اس زمانہ کا ایک گہرا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔"

یہاں پر ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، کہ اس دور میں ادب کا تصور یا اس کے تقاضے اتنے ہمہ گیر اور وسعت طلب نہیں تھے۔ شاعری حاصل کل تھی، مختصر نظموں کا وجود صنفی حیثیت سے نہیں تھا۔ مختصر مثنویات یا قطعات اس کمی کو پورا کرتے تھے۔ قصیدہ کا بازار سرد پڑ چکا تھا۔ بس لے دے کے ایک غزل تھی جو شمع محفل طرح ہر طرف روشنی بکھیر رہی تھی۔ غزل اشاروں کی زبان ہے، وہ تاثرات کی جلوہ گاہ ہے، یہاں ہر بات رمز وایما کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کی جاتی ہے۔ یہاں کھل کر بات کرنا تہذیب کے خلاف ہے۔ ہر تفصیل اجمال کے پردے میں پیش کی جاتی ہے اس کے لئے برسوں کاوش کرنا پڑتی ہے۔ خون جگر پینا پڑتا ہے تب کہیں فن کی نمود ہوتی ہے۔ شاعر کی ساری توجہ اگر اس بات پر مرکوز ہو کہ طویل داستان ایک جملہ میں کہہ دی جائے تو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی طویل خونی داستان تفصیل کے ساتھ کیسے معرض وجود میں آسکتی تھی ——؟ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ وہ دور غزل کا دور تھا۔ غزل میں واقعہ اشارہ کا کام کرتا ہے، اشارات خاص نہیں ہوتے وہ تو عمومی طور پر خیال کو ملتے جلتے چند عنوانات کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ شمع خاموش زندگی کی مرثیہ خواں ہے قیس بے سروسامانی کا نمائندہ ہے، بجلی حادثات کا نام ہے، نشیمن گھر اور قصر سلطنت دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ گلستان پر بجلی گرانا گھر کی تباہی سے لے کر وسیع سلطنت کی تباہی کو ایک رنگ میں، ایک انداز میں، اور ایک وقت میں بیان کر دیتا ہے"——
اس طرح خاص خاص واقعات کو اگر تفصیل سے لکھا جائے تو آنکھیں اشک خون سے لبریز ہو جائیں۔ غزل میں احساسات عام اشارات کے حجابات میں اس طرح بیان

ہوتے ہیں کہ حقیقی واقعات کی تیز روشنی صرف چند جھلکیاں دکھا پاتی ہے۔ اس دور کے
صد ہا اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں اتنی غم زدگی محسوس ہوتی ہے کہ پڑھتے پڑھتے
سانس رک سی جاتی ہے اور بے اختیار محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی خون شدہ تمنا کا بیان
ہے یا کسی اہم داستانِ غم کی ترجمانی ہے اور یقیناً یہ شعر کہتے وقت شاعر کا دامن اشک
خون سے گل زار بن گیا ہوگا لیکن اس پر رمز و ایما کا دھندلکا چھایا رہتا ہے جس کے
حجابات حدِ نظر کا کام دیتے ہیں، اور ہم اس کی تعبیر سے مایوس ہو کر صرف بیانِ غم کی
دل دوز کیفیات میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس
دور کے شعراء نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر جو کچھ کہا وہ اشارات و کنایات کے
پردے میں دور کا جلوہ بن کر رہ گیا۔ نیز اتنا کہا کہ شاعری پر اس کا تحریکاتی اثر زیادہ
نہیں پڑا صرف چند دنوں کے لئے اشک خون کی رنگینیاں بڑھ گئیں۔"[۱]

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں :

"مورخوں، سیاست دانوں اور دوسرے اربابِ فکر کی نظر میں
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا پس منظر چاہے کچھ بھی ہو ۔۔۔ اس حقیقت
سے کون انکار کرے گا کہ اس جنگ نے اہلِ ملک کو بڑا آتشیں شعور بخشا
اور ان کے ذہنوں میں احساس و عرفان کی وہ آگ سلگ اٹھی جو جد و جہد
آزادی کا سب سے اہم سرمایہ ہوتی ہے۔ آپ اس جنگ کو محض ایک واقعہ
قرار دیتے ہوں یا ایک حادثہ یا ایک ہنگامہ ۔۔۔۔ آپ کو بہر حال اس
اس کا یہ "کنٹرول ہیومشن" تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔"[۲]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"انسان کی قوت و عظمت یوں تو اردو اور فارسی کے صوفی شعراء
کے دم سے ہماری شاعری کا ایک دل آویز موضوع رہ چکی ہے ۔۔۔ لیکن

---

[۱] انقلاب ۱۸۵۷ء۔ سید حسن خاں

[۲] : جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی اہمیت۔ احمد ندیم قاسمی (سن ستاون میری نظر میں۔ ص

اردو شاعری میں گمبھیرتا، توانائی اور بڑائی کا احساس ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہی نمایاں ہو پایا ہے۔ اور اسی ایک صدی میں بے ثباتی دنیا پر رونے رلانے کے بجائے زندہ رہنے کی مسرت اور عبادت کا شعور عام ہوا ہے۔ فن شعر کی دنیا پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا یہ بڑا احسان ہے کیوں کہ یہی شعور تو اردو غزل کو اس کے صدیوں کے خول سے نکال کر باہر کی دنیا میں لے آیا اور اگرچہ بعض غزل گو شعرا کی آنکھیں ان کی چمک سے چوندھیا گئیں اور سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے ان کی سانسیں پھول گئیں اور وہ پھر سے اپنے ذہنوں کی گپھاؤں میں اتر جانے کے لئے برسوں ہاتھ پیر مارتے رہے لیکن آخر کار اردو شاعر ایک بدلتے ہوئے ماحول اور معاشرہ کا فرد تھا اس لئے آہستہ آہستہ ہماری غزل کے افق وسیع ہوتے گئے اور جو غزل وجود میں آئی جس کی ایک نکھری ہوئی صورت آج ہمارے سامنے ہے۔ اردو غزل کے ساتھ شاعری کی دوسری اصناف کا بدلنا لازمی تھا کیوں کہ غزل کا بدلنا تو سلطنت شعر کے تاج دار کا بدلنا تھا۔ سو یہ خوش گوار تبدیلی سب اصناف سخن پر اثر انداز ہوئی۔[۱]

دہلی کے جن شعرا نے غدر کی خون آشامیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں ان میں غالب، شیفتہ، صہبائی، حالی، داغ، آزاد وغیرہ تھے۔

مومن کا انتقال ۱۸۵۱ء میں ہو چکا تھا۔ غالب اس دور کے معاشرے کے اہم تہذیبی نمائندہ ہیں۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات دیکھے ہی نہیں بلکہ اس سے متاثر بھی ہوئے، غالب کے یہاں ایک قطعہ کے سوا ایسا کوئی کلام نہیں ملتا جس میں

۱۔ سن ستاون میری نظر میں، مرتبہ ناصر کاظمی، انتصار حسین (مضمون جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی اہمیت از احمد ندیم قاسمی ص ۳۲-۳۱)

انگریزی سامراج کی زیادتیوں کو پیش کیا گیا ہو۔ اور جاں باز قومی مجاہدین کی قومی تحریک کی داد دی گئی ہو۔ اس کے برخلاف انھوں نے جگہ جگہ اس لوٹ مار کے خلاف اظہار غیظ و غضب کیا ہے۔ تحریک کی ناکامی سے ان کو یہ ملال نہیں ہے کہ قومی تحریک ختم ہو گئی بلکہ یہ غم ہے کہ دلی کے کوچے وہ نہیں رہے، وہ ایوان ویران ہو گئے جو اہل علم کی پرواں گاہ تھے اور سب سے بڑھ کر ان کی پنشن پر اثر پڑا۔ پھر بھی ان اشعار سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک معاشرت موت کی نیند سو گئی، ایک تہذیب فنا ہو گئی، شہر برباد ہو گئے، بستیاں اجڑ گئیں، آبادیاں ویران ہو گئیں، افراد بے خانماں ہو گئے ——

نواب علاؤالدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ۔۔۔

"میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے"[1] انھوں نے اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو خط لکھتے ہوئے "جنگ آزادی" کی ناکامی کے بعد کے دور کو دوسرا جنم قرار دیا ہے جو پہلے جنم سے یکسر مختلف ہے۔ صدیوں کی حیثیت قدروں کی تبدیلی کا یہ عرفان اور کاروبار حیات کے سراسر منقلب ہو جانے کا ادراک معمولی بات نہیں ہے۔

غالب کی زندگی میں سرکاری پنشن کی ضبطی اور واگزاری کا معاملہ ہی ایسا نہ تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جس نے اس کے بعد غالب کی زندگی کو گوناگوں آلام کا شکار بنا دیا تھا بلکہ اس ہنگامہ کے نتیجہ میں شہر اور اہل شہر کی وہ تباہی و بربادی بھی تھی جسے غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا اور جس نے ان کی زندگی کے ان لمحوں کو موت سے بدتر بنا دیا۔ یہ ہنگامہ ایک ایسا خوفناک زلزلہ تھا جس نے شہر اور اہل شہر پر یکبارگی قیامت صغریٰ نازل کر کے ہی دم لیا بلکہ مدت تک اس کے جھٹکے برابر محسوس ہوتے رہے۔ اسی مستقل تباہی، مسلسل بربادی کا دردانگیز عالم غالب نے اپنے خط میں اس طرح کھینچا ہے:

"اس شہر پر پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے ہوا۔ پہلا حملہ باغیوں

---

[1] غالب۔ غلام رسول مہر ص ۲۷۲

کا جس میں شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا خاکیوں کا اس میں جان و مال، عزت و ناموس، مکان و مکیں و آسمان و زمین اور آثار ہستی سراسر لٹ گئے، تیسرا لشکر کال کا جس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے؛ چوتھا لشکر ہیضہ کا جس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی، نہ لشکر نے اب تک شہر سے کوچ کیا ہے۔"

اس ہنگامے کے بعد کافی مدت تک شہر انگریزی فوج کی چھاؤنی بنا رہا اور انگریزی حکام شہریوں سے بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :

"ہے ہے کیوں کر لکھوں کہ حکیم رضی الدین خاں کو ایک خاکی نے گولی ماردی اور احمد حسین خاں اور ان کے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر کے سبب نہ جا سکے۔ یہیں رہے بعد فتح دہلی کے دو نوں بے گناہوں کو پھانسی ملی، میر چھو ٹم نے بھی پھانسی پائی۔"

یوسف مرزا کے نام ایک خط میں درد انگیز واقعات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میرا حال سوائے میرے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے؟ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم رزق، غم فراق، غم عزت —— غم مرگ میں قلعہ نا مبارک —— قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں، مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا مرزا احمد، ناصر حسین کا بچہ، مصطفی خاں اور اس کے دو بیٹے۔ کیا میں ان کو عزیزوں کے برابر نہیں جانتا، انہیں کہاں سے لاؤں؟ —— غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے کاش یوں ہوتا جہاں ہوتے خوش رہتے۔ گھر ان کے بے

چراغ دہ خود آوارہ۔ ۹۶؎

غالب کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کی موت اور مصائب کا غم اپنی تباہی اور بے رونقی سے بھی زیادہ تھا مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی تباہی اور بے رونقی کے غم میں مرتا ہوں جو غم مجھ کو ہے اس کا حال تو معلوم مگر اس غم کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریز کی قوم میں جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے کوئی میرا دوست تھا کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد اور ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ معشوق تو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو زندگی اس کی کیوں کر نہ دشوار ہو ــــــ"

بہر حال ان خطوں میں غدر اور بعد از غدر کی کوئی مربوط اور مفصل تاریخ تو نہیں ہے مگر وہ سب کچھ ہے جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں اور جسے خود غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

بہادر شاہ ظفر پر تو اس انقلاب کی براہ راست اثر ہوا کیوں کہ وہ خود اس کے شریک تھے۔ ان پر انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ انھیں قلعے سے باہر نکالا گیا۔ ہمایوں کے مقبرہ میں پناہ گزیں ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ان کے دو بیٹوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا پھر وہ جلا وطن کر دیے گئے۔ ظفر کی شاعری میں ان حالات کی گونج سنائی دیتی ہے بالواسطہ طور پر تو غزل کے اشعار میں اس کی ترجمانی جگہ جگہ موجود ہے لیکن براہ راست بھی انھوں نے اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس غزل میں تو انقلاب اور اس کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی تصویر کھینچ دی ہے:

۹۶؎۔ خط بنام یوسف مرزا۔ (از خطوط غالب مرتبہ مالک رام۔ ص ۲۴۳)

کیا خزاں آئی چمن میں ہر شجر جاتا رہا
چھن گیا سکھ چین اور لخت جگر جاتا رہا

کیا خوشی ہر ایک کو تھی کر رہے تھے سب عا
جب گھسی فوج نصاریٰ ہر اثر جاتا رہا

کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
بیٹھا دودو پہر اب تخت پر جاتا رہا

شام کو غنچہ کھلا تھا چوک کے بازار میں
اب وہاں پر یا خدا لاکھوں کا سر جاتا رہا

رہتے تھے اس شہر میں شمس و قمر حور و پری
لوٹ کر ان کو کوئی لے کر کدھر جاتا رہا

آگوں تو تھا شہر دہلی اب ہوا اجڑا دیار
کہہ ظفر یہ کیا ہوا جو بن کدھر جاتا رہا

یہ اشعار اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ظفر کو صرف اپنا غم نہیں تھا، وہ صرف اپنی حکومت کے ختم ہونے پر ماتم نہیں کر رہے تھے بلکہ انھیں تو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ سارے چمن پر خزاں آگئی ہے اور ہر ایک کا چین اور صبر ختم ہو گیا ہے۔ نہ تہذیب رہی، نہ معاشرت، نہ علم رہا نہ ادب، نہ فن رہا نہ ہنر۔۔۔۔۔ ہر چیز فنا کی نیند سو گئی ظفر کو یہی غم کھائے جاتا ہے۔

حالی نے بھی ان حالات پر ماتم کیا ہے اور انقلاب کی ناکامی کے ہاتھوں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس پر آنسو بہائے ہیں۔ تہذیب کا جس طرح خاتمہ ہوا ہے، ادبی صحبتیں جس طرح برہم ہوئی ہیں ان پر وہ کڑھتے ہیں اور "تذکرہ دہلی مرحوم" اس انداز سے سناتے ہیں:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اسی طرح دہلی کے بیش تر شعرا نے اس زمانہ میں اسی زاویہ نظر سے انقلاب اور جنگ آزادی کی ناکامی پر نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں کا مجموعہ فغان دہلی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی ذاتی پریشانیوں اور مصیبتوں کا بیان نہیں کیا ہے۔ عام اجتماعی زندگی کی زبوں حالی کے مرثیے کہے ہیں۔

لکھنؤ میں بھی انقلابی سرگرم رہے لیکن وہاں کے شاعر چوں کہ انفرادیت میں زیادہ گم تھے، اور ان کے پاس اجتماعی شعور نسبتاً کم تھا۔ اس لئے لکھنؤ کے شعرا کے یہاں اس واقعہ کے اثرات زیادہ نہیں ملتے۔ پھر بھی بعض شعرا نے اس تباہی کا بیان اپنی شاعری میں کیا ہے جو انقلاب کی ناکامی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔

منیر شکوہ آبادی اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے انھیں اس ہنگامہ میں کالے پانی کی سزا ہو گئی تھی۔ کئی سال وہ جزائر انڈمان میں اسیر فرنگ رہے۔ ان کے کئی قصیدے اور غزلیں اس تباہی و بربادی کی زندہ تصویریں ہیں۔

امیر مینائی کے اشعار میں بھی جا بجا ان حالات کی جھلک ملتی ہے۔ میر امان علی سحر نے نواب منور الدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا اس کی تشبیب کا موضوع لکھنؤ کی تباہی ہے ؎

تمام ہند کی تھا جان لکھنؤ اپنا
ہمارا خسرو جم جاہ جان عالم تھا
جہاں بے تاب دبے جان ہے کسی میں جان نہیں
فراق موت سے بدتر ہے اس مسیحا کا

ان اشعار میں واجد علی شاہ کا ذکر جس انداز سے ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لکھنؤ میں کس قدر مقبول تھے۔ ان کے معزول ہونے کے بعد جو انقلاب ہوا اس کے نتیجے میں لکھنؤ میں جو تباہی آئی۔ لوگ جس طرح سے در در کی خاک چھانتے پھرے اس کی تفصیل ان اشعار میں مل جاتی ہے۔

بہر حال دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کے شاعروں نے انقلاب اور اس کی ناکامی کے

نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ شہر آشوب کی سی کیفیت زیادہ ہے۔ مرثیہ کا سا انداز غالب ہے۔ اس سلسلہ میں کسی جارحانہ انداز کا اختیار کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ جو کچھ کہا گیا اس کی تہ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ موجود ہے اور یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ جس تباہی سے لکھنؤ، دلی اور دوسرے مقامات کو دوچار ہونا پڑا اس میں پوری طرح انگریزوں کا ہاتھ تھا۔ تخلیقی فن کار اس پر یقین رکھتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور انقلاب کے موضوع نے، اس میں شک نہیں کہ ہمارے ادب و شعر میں کسی عظیم تخلیق کو جنم نہیں دیا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس انقلاب نے ایسا ماحول ضرور پیدا کر دیا جس میں ادب و شعر کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہونے کے مواقع ملے۔ یہ انقلاب اور جنگِ آزادی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اجتماعی اور قومی تحریک تھی۔ ہماری قومی تحریک میں یہ پہلا موقع تھا کہ لوگ ایک مرکز پر جمع ہوئے، ایک ایسے نصب العین کو اپنے سامنے رکھا جس کی نوعیت تمام تر قومی اور وطنی تھی۔ قومی زندگی کا یہ نیا موڑ تھا۔ جب زندگی اس موڑ پر آئی تو اس نے بھی انفرادیت کے دائرے سے نکل کر اپنے آپ کو اجتماعیت کے حدود میں داخل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعر و ادب کی فضا بدل گئی۔ سارا ماحول تبدیل ہو گیا۔ اس نے نئی راہیں اختیار کیں۔ اس صورتِ حال کی جھلک ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پیدا ہونے والے ادب و شعر میں نظر آتی ہے۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد ادب و شعر کو ان حالات سے روشناس ہونے میں دقت لگا لیکن جب روشناس ہوا تو اس میں خاصی شدت تھی۔

سرسید کی ادبی تحریک ان حالات کی عکاس ہے۔ سرسید کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست تھے۔ انھوں نے جنگِ آزادی کو سراہا نہیں بلکہ اس انقلاب کو ہندوستانیوں کی نادانی بتایا ہے لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ سرسید انگریزوں کے دشمن نہ تھے تو دوست بھی نہ تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر انگریزوں کی غلامی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ انھوں نے مصلحت

کے پیش نظر وقتی طور پر انگریزوں سے مصالحت کرلی تھی اور اسی مصلحت کے پیش نظر ایک زمانے تک وہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ جو شکوک انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہوگئے ہیں، انھیں کسی طرح دور کیا جائے۔ سرسید ایک محب وطن اور قوم پرست تھے اور انھوں نے جن خیالات و نظریات کو پیش کیا ہے ان میں اسی زاویہ نظر کی کارفرمائی ہے' انھوں نے انگریزوں سے اس لئے مصالحت کی اور اس خیال سے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا کہ آئندہ قومی مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ اس وقت حقیقت پسندی کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کے خلاف عملی طور پر جنگ کی جائے کیوں کہ انقلابیوں کو بہر حال شکست ہوچکی تھی اور انگریز حکمراں ہوگئے تھے۔ ان کی حکومت آسانی ختم نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے سرسید نے محاذ بدل دیا لیکن جنگ جاری رہی۔ محاذ کی اس تبدیلی سے غلط فہمیاں پھیلیں، کہیں کہیں ان کے طرز عمل سے انگریز دوستی کی بو آئی ہے اس کے لئے انھیں معاف تو نہیں کیا جاسکتا لیکن وسیع النظری سے کام لے کر نظر انداز کر دیا جائے تو سرسید کی پوری تحریک انقلاب کا ایک حصہ نظر آئے گی۔

سرسید کی تحریک بنیادی طور پر تعلیمی تحریک تھی لیکن یہ تحریک بہ یک وقت سیاسی بھی تھی، مذہبی بھی، معاشرتی بھی، علمی بھی اور تہذیبی بھی۔ سرسید دوررس نگاہ کے مالک تھے، انھوں نے اپنی تحریک کو تعلیمی رنگ دیا۔ انقلاب اور تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی کوئی سیاست باقی نہ رہی تھی۔ سرسید نے اس صورتحال کو بھانپ لیا تھا اور تعلیم کے پردے میں سیاست اور مذہب، تہذیب و معاشرت کو زندہ کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ ادب و شعر کو انھوں نے ان مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ دنیائے شعر و ادب میں بھی انقلاب آگیا۔ غور سے دیکھا جائے تو اس انقلاب میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا بڑا ہاتھ ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کو اس سرزمین سے نکال باہر کیا جائے، اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے مذہب، اپنی معاشرت، اپنی تہذیب

اور اپنے ادب کو زندہ رکھا جائے، چنانچہ انقلاب سے متاثر ہوکر جو ادب تخلیق کیا گیا ہے اس نے ان پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور یہ سارا ادب وہی ہے جس کی تخلیق بالواسطہ یا براہ راست سرسید کی تحریک کے زیر اثر آئی ہے۔ اگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ادب و شعر میں ایک اجتماعی شعور نہ پیدا کیا ہوتا تو ان موضوعات کی طرف کسی حال میں بھی توجہ نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ اس انقلاب اور جنگ آزادی کا فیض ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انقلاب کی ناکامی نے زندگی اور ادب دونوں میں خاصے عرصے تک انقلابی آہنگ کو پیدا نہیں ہونے دیا۔ برخلاف اس کے ان میں ایک اصلاحی رنگ کو جگہ دی۔ چنانچہ اس کے بعد کی زندگی اور ادب میں اصلاحی رنگ کا اثر ملتا ہے اس کی نوعیت اجتماعی ہے انقلابی آہنگ اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا کیوں کہ خود انقلاب کا یہ میلان ادب میں موجود نہیں تھا۔ انقلاب کی نوعیت اضطراری تھی اور اضطراری تحریک سے ادب اس وقت تک متاثر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اسے اپنے مزاج کا جزو نہ بنالے۔ لیکن زندگی کے جو پہلو انقلاب کے پیش نظر تھے ان کا خیال اس کے بعد کے ادب میں آیا اور اس طرح آیا کہ وہ انھیں پہلوؤں کی ایک داستان معلوم ہوتی ہے۔

اس دور میں مذہب کی اہمیت پوری شدت سے محسوس کی گئی ہے اور اس کے نئے تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔ سرسید، شبلی، نذیر احمد پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اپنی تہذیبی روایات کو زندہ رکھنے کا خیال بھی اس وقت کی زندگی میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے اثرات سرسید، حالی، شبلی، ذکاءاللہ اور آزاد کے یہاں ملتے ہیں۔ اس میلان نے سیاسی اور ادبی تاریخیں لکھوائی ہیں۔ شاعروں اور فن کاروں کی زندگی کے سوانحی حالات مرتب کئے ہیں۔ فن تعمیر اور قدیم عمارتوں کی طرف توجہ مبذول ہوئی ہے۔ رہن سہن اور آداب معاشرت کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ ماضی کا خیال اس دور کے ادب پر چھا گیا ہے۔ لیکن حال اور مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند نہیں ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات نے قومی زندگی میں جن معاملات و مسائل کو پیدا کیا تھا

ان سب کو اس زمانہ کے ادب نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور اس طرح کہ مستقبل ان کی نظر میں رہا ہے۔ حالی کی قومی اور اصلاحی شاعری، نذیر احمد کے معاشرتی اور تہذیبی ناول اس میلان کے ترجمان اور عکاس ہیں۔

بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام میلانات محض جذبات کے راستے سے اس زمانہ کے ادب میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی نوعیت تمام تر عقلی ہیں اسی لئے عقلیت اور افادیت اس زمانہ کے ادب کی بنیاد ہے۔ ہر صنف ادب میں اس کا سب سے پہلے احساس ہوتا ہے۔

ادب و شعر کے یہ میلانات جن کو ۱۸۵۷ء نے پیدا کیا کسی خاص وقت تک محدود نہیں رہے۔ ان میں ارتقائی عمل جاری رہا۔ اس دور کے ادب کے بعد جو ادب ہمارے یہاں تخلیق ہوا وہ درحقیقت انھیں میلانات کے تسلسل کی تصویر ہے۔

حالی کے بعد اقبال، جوش کی شاعری۔ شبلی اور نذیر احمد کے بعد ابوالکلام آزاد سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی کی نثریں تحریریں اور حالی اور آزاد کے بعد عبدالحق اور دوسرے محققین اور نقادوں کی کاوشیں اسی تسلسل کی ترجمان ہیں۔ اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ترقی پسندوں کی تحریک نے اپنا سلسلہ اسی انقلاب سے ملایا ہے اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے زیر اثر جو تخلیقات پیش کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں اسی انقلاب کا خیال اور اثرات کی چھاپ ملتی ہے۔

باب سوم

جزائر انڈمان میں اسیر شاعر و ادیب

(حیات اور کارنامے)

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے زندگی اور سماج کے لئے ہر دور میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی ادبی وعلمی کاوشیں اور کوششیں آزادی و حرّیت اور آسائش و آرام کے دور ہی سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ انھوں نے قید و بند اور اسیری میں بھی ان روایات کو قائم رکھا ہے۔ یہاں ہم جزائر انڈمان ونکوبار کے فن کاروں کی ان علمی وادبی کاوشوں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو انھوں نے گھر اور وطن سے ہزاروں میل دور، بالکل بے سروسامانی کی حالت، ناموافق آب و ہوا اور قید و بند کی صعوبتوں میں انجام دیں، ان جزائر میں تحریک آزادی کی دو جماعتیں پہونچیں۔ پہلی جماعت جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے قیدیوں پر مشتمل تھی، اور دوسری حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے مجاہدین کی، جس کو عرفِ عام میں "وہابی تحریک" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جزائر انڈمان ونکوبار خلیج بنگال میں مشرق کی طرف کلکتہ سے تقریباً چند سو میل دور واقع ہیں، یہ مجموعہ جزائر ۱۲۴۶ مربع میل کے رقبہ پر محیط ہے[1]۔ اس مجموعہ میں ۲۰۴ جزیرے ہیں اور جزائر انڈمان کے نام سے مشہور ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ جزائر ملک برہما سے متعلق تھے۔ ان جزائر کا ذکر سب سے پہلے عرب جغرافیہ نویسوں نے نویں صدی عیسوی میں کیا ہے۔

---

[1] تاریخ عجیب (تاریخ پورٹ بلیر) از محمد جعفر تھانیسری، ص ۴

ستمبر ۱۷۸۹ء میں کمپنی کی حکومت نے طے کیا کہ حبس دوام بعبور دریائے شور کے قیدی جزائر انڈومان ونکوبار میں رکھے جائیں چنانچہ کیپٹن AKHI BALD BLLAIR اور کپتان مورس نے وہاں پہونچ کر جزیرۂ چاتم میں لنگر ڈالا اور وہاں کی صفائی کرائی مکانات تعمیر کرائے[۱] لیکن طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے ۱۷۹۶ء میں یہ جزیرہ سنسان ہوگیا۔ اسی کیپٹن بلیر کے نام پر پورٹ بلیر کہلایا۔[۲]

۱۸۲۹ء میں ایک جرمن جہازراں ان جزائر کے قریب پہنچ کر لنگرانداز ہوا مگر مارا گیا۔ ۱۸۴۴ء میں پھر مقامی باشندوں نے ان لوگوں سے مزاحمت کی جو وہاں قبضہ کرنے پہونچے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں دوبارہ طے کیا گیا کہ حبس دوام بعبور دریائے شور کے قیدیوں کو جزائر انڈمان میں رکھا جائے مگر انقلاب ۱۸۵۷ء کی وجہ سے یہ مسئلہ التوا میں پڑا رہا۔ جنگ آزادی کے سلسلے میں ہزاروں اشخاص کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔ ان قیدیوں کو جیلوں میں رکھنے سے فساد کا خطرہ تھا۔ اور "حکومت مناسب نہ سمجھتی تھی کہ انھیں عام جیلوں میں رکھے۔ ڈر یہ تھا کہ مبادا ان کے خیالات سے دوسرے قیدی متاثر ہوں۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا کہ جزائر انڈمان کو از سرنو آباد کیا جائے اور ۱۸۵۷ء کے قیدی وہاں بھیج دیے جائیں[۳]"۔ اس لئے حکومت نے نومبر ۱۸۵۷ء میں FMOVA کو معائنہ اور رپورٹ کے لئے بھیجا اس نے موافقت میں رپورٹ دی پھر مراسلہ نمبر ۸۰ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۸۵۸ء کے ذریعہ کرنل مین کو یہ حکم ملا کہ مولمین جیل سے کچھ قیدی لے جاکر جزائر مذکور پر سرکار کا قبضہ کیا جائے اور انقلابی قیدیوں کے لئے جگہ صاف کردی جائے۔ حکم کے مطابق ۲۲ فروری ۱۸۵۸ء کو ان جزائر پر قبضہ کیا گیا۔ ۱۰ مارچ ۱۸۵۸ء کو ڈاکٹر واکر سپرنٹنڈنٹ جیل آگرہ ۱۸۵۷ء کے قیدیوں

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا برٹینکا۔ ج ۱ ص ۸۷۹ طبع ۱۹۵۵ء

[۲] تاریخ عجیب، ص ۱۲

[۳] سرگزشت مجاہدین ج ۴ ص ۴۲۷ از غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶ء

کو لے کر وہاں پہونچے۔ اور اس جگہ آبادی شروع ہوئی۔ مقامی باشندوں کو انگریزوں کی یہ مداخلت سخت ناگوار گزری انھوں نے حملہ کر دیا لیکن شکست کھا کر اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔

جزائر انڈمان میں مختلف ملکوں، صوبوں، قوموں اور مذاہب کے لوگ آباد ہو گئے اس مخلوط آبادی میں بڑی رنگا رنگی تھی۔ بہ قول مولوی محمد جعفر تھانیسری:

"پورٹ بلیر ایک ایسی جگہ ہے جس میں چینیا، برما، سلائی، سنگلی، جنگلی، نکوباری، کشمیری، پشتونی، ایرانی، مکرانی، عرب، حبشی، پارسی، پرتگیز، امریکن، انگریز، ڈین، فرینچ، وغیرہ اور ہندوستان کے سب ضلعوں اور شہروں کے آدمی مثل بھوٹیا، نیپالی، سندھی، پنجابی، گجراتی، دیس والی، ہندوستانی، اہل برج، آسامی، میتھلی، بندیل کھنڈی، اڑیا، تلنگی، مرہٹے، کرناٹکی، مدراسی، ملیالم، گونڈ، بھیل، بنگالی، کول، سنتھال سب موجود ہیں۔ جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو اپنی اپنی زبان میں بات چیت کرتے ہیں مگر بازار اور کچہریوں کی زبان یہاں ہندوستانی ہے اس لئے ہر آدمی کو خواہ وہ کسی ملک کا ہو، یہاں آکر ہندستانی زبان سیکھنا ضرور پڑتی ہے۔ بلکہ بے سیکھے، تھوڑے روز کے بعد ہر آدمی خود بخود ہندوستانی بولنے لگتا ہے۔ کیوں کہ جب تک کوئی آدمی ہندوستانی نہ بولے اس کا گزارا نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں پردۂ زمین پر کوئی دوسری جگہ اس بات میں پورٹ بلیر کے مقابل نہ ہوگی، یہاں ایک ایسا میلہ جمع ہوا ہے کہ شاید آج تک پردۂ زمین پر کہیں ایسا مجمع مختلف نہ جمع ہوا ہوگا۔"[1]

---

[1] تواریخ عجیب (کالا پانی)، از محمد جعفر تھانیسری مرتبہ محمد ایوب قادری (مسلمان اکیڈمی کراچی سنہ ۱۹۶۲ء) ص ۲۰۲ – ۲۰۱

۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک یہاں کی آب و ہوا نہایت خراب تھی۔ فضل حق خیرآبادی لکھتے ہیں:

"یہ ناقابل برداشت حالات تھے کہ میں متعدد سخت امراض میں مبتلا ہوگیا، جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا اور میری عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس دشوار اور سخت رنج و غم سے کیوں کر چھٹکارا حاصل ہوسکے گا۔ خارش میں ابتلا اس پر مستزاد ہے۔ صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں۔"[1]

ہزارہا آدمی ان بیماریوں کی نذر ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ان جزائر میں صفائی کا انتظام ہوا، کاشت کاری اور تجارت کی آسانیاں فراہم ہوئیں، جنگلوں کا صفایا ہوا، اسکول، مدرسے، شفاخانے اور عدالتیں قائم ہوئیں۔ جب قیدی عورتیں وہاں پہنچنے لگیں تو شادی بیاہ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ان قیدیوں کو رفتہ رفتہ شہریوں کی سہولتیں میسر آنے لگیں اور سماجی زندگی کا از سرِ نو آغاز ہوا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں ہزاروں قیدی ان جزائر میں پہونچے بہ قول فضل حق:

"غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسوں راجے، مہاراجے، نواب اور زمین دار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالہ دار، جمعدار وغیرہ وغیرہ وہاں قید ہیں۔"[2]

---

[1] الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) از مولانا فضل حق خیرآبادی ترجمہ و ترتیب مولوی عبدالشاہد خاں شیروانی (بجنور ۱۹۴۷ء) ص ۲۴۵۔ [2] تواریخ عجیب (کالا پانی) ص ۱۲۶

جعفر تھانیسری ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کی فہرست یا تمام حضرات کا مختصر حال لکھ دیتے تو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں بیش قیمت اضافہ ہو جاتا ـــــ بہرحال ان لوگوں کے قیام نے غیر آباد اور ویران علاقوں میں زندگی کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ انھوں نے کاروبار شوق جاری رکھا۔ درس و تدریس اور تذکیر و تبلیغ سے ان جزائر کی فضا گونجنے لگی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔

عبدالشاہد خاں شیروانی لکھتے ہیں:

''ان علماء کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابیٔ آب و ہوا، تکالیف شاقہ، اور درد جدائی احباب و اعزّا کے باوجود علمی مشاغل جاری رکھے۔ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تاریخی یادداشت، ترتیب واقعات قواعد فنون اور ضوابط علوم سب ہی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں''[1]

مولوی فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی مفتی سید احمد بریلوی، مولوی ایوب خاں کمبی، چمن خاں، نواب قادر علی خاں، منشی اکبر زماں، مولوی محمد جعفر تھانیسری، منیر شکوہ آبادی، قاضی سرفراز علی وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے جزائر انڈمان و نکوبار کی اسیری کے زمانے میں شمع علم کو جلائے رکھا ہے، چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن جاری رکھی ہے اور خون جگر سے فن کی نمود کرتے رہے ہیں۔

ان شمع ادب کے پروانوں کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء و مشائخ انڈمان اور نکوبار کے جزائر میں اسیر ہو کر پہونچے تھے ان میں شاہ بولن سیوہاروی (ف ۱۲۷۶ھ)، مولوی احمد اللہ صادق پوری (ف ۱۲۹۸ھ) مولوی لیاقت علی

---

[1] الثورۃ الہندیۃ، ص ۱۷۲ مرتبہ عبدالشاہد شیروانی۔

الہ آبادی، مولوی امیرالدین ساکن مالدہ، مولوی تبارک علی، مولوی عبدالرحیم (ف ۱۳۴۱ھ) میاں عبدالغفور (ف ۱۹۱۴ء) مولوی مبارک علی، مولوی محمد ابراہیم منڈل، مولوی محمد یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ)[۱] شیخ فصاحت اللہ بدایونی، شیخ سلیم، شیخ آیت اللہ بدایونی، اور شیخ فضل احمد بدایونی وغیرہ[۲] کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جن کی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رہیں لیکن ان بزرگوں کی کوئی بھی تصنیف و تالیف جزائر انڈمان کی اسیری کے دوران نہیں ملتی ہے۔

---

[۱] تواریخ عجیب (کالاپانی) تذکرہ رجال مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۲۶۶ - ۲۲۴۔
[۲] "بدایوں ۱۸۵۷ء میں"، ص ۹۷

منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، سید احمد حسین شاد کے بیٹے تھے، ان کا سلسلۂ نسب حضرت علی نقیؑ سے ملتا ہے۔ منیر کے سن ولادت میں اختلاف ہے۔ بعض تذکروں میں ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۵-۱۶ء اور بعض میں ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸-۱۹ء ان کا سال پیدائش لکھا ہے۔ مخمور اکبرآبادی نے ان کا زمانۂ حیات ۱۲۳۴-۳۵ھ / ۱۸۱۹ء سے ۱۲۹۸-۹۹ھ / ۱۸۸۱ء تک تسلیم کیا ہے[1]۔ سید ہادی حسن جعفری نے ۱۲۳۴ھ[2] / ۱۸۱۸-۱۹ء اور حافظ مولوی جلال الدین احمد جعفری نے ۱۲۳۳ھ[3] / ۱۸۱۷-۱۸ء اور محمد علی خاں اثر رامپوری نے ۱۲۲۹ھ[4] / ۱۸۱۳-۱۴ء سالِ ولادت تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ

"منیر کی ولادت ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء میں ہوئی۔"[5]

تعارف تاریخ اردو میں سن پیدائش ۱۸۱۴ء ہے[6]۔

منیر نے اپنے دیوان منتخب العالم کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ دیوان انہوں نے ۳۵ برس کی عمر میں مکمل کر لیا تھا۔ منتخب العالم ۱۲۶۴ھ میں مرتب ہوا۔ اس لحاظ سے منیر کا سن پیدائش ۱۲۲۹ھ ثابت ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

---

[1] صحیفہ تاریخ اردو، ص ۲۴۳۔ [2] ہادی اردو مطبوعہ نامی پریس میرٹھ ۱۹۳۷ء
[3] قند اردو ترمیم شدہ اڈیشن، ص ۳۱۸۔ [4] مقالہ بعنوان منیر شکوہ آبادی، ہماری زبان، علی گڑھ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۹ء۔ [5] لکھنؤ کا دبستان شاعری، اردو مرکز لاہور، دوسرا اڈیشن اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۴۲۴۔ [6] تعارف تاریخ اردو جدید اڈیشن مارچ ۱۹۶۳ء ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔

"سند عمر تا حال سی و پنجم مرحلہ از مراحل زندگی طے کردہ توفیق اتمام
این دیوان (منتخب العالم) دادہ است"[1]

تقویم ہجری و عیسوی کی رو سے ۱۲۲۹ھ کا آغاز ۲۴ دسمبر ۱۸۱۳ء سے ہوتا ہے اس لئے منیر کا سن ولادت ۱۸۱۳ء کے بجائے ۱۸۱۴ء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔[2]

منیر پیدا شکوہ آباد میں ہوئے، بچپن آگرہ میں گزرا، جہاں ان کے والد صدر نظامت میں سررشتہ دار تھے۔ اس زمانہ میں آگرہ شعر و شاعری کا مرکز بن گیا تھا۔ بیشتر ارباب کمال وہاں جمع ہو گئے تھے۔ منیر کے والد سید احمد حسین شاد، مرزا سودا کے شاگرد اور شیخ سخن کے پروانے تھے۔ منیر اسی علمی و ادبی اور شاعرانہ ماحول میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی پدر بزرگ وار نے عربی و فارسی پڑھائی اور بڑے بھائی سید اولاد حسین مجتہد نے دینیات کی تعلیم دی۔ درسیات تکمیل کے ساتھ ساتھ منیر مشق سخن بھی کرتے رہے اور

"جواں ہوئے تو شعر و شاعری کی محفلوں میں خوب چمکے"[3]

انھیں دنوں نواب نظام الدولہ آگرہ آئے، ان کے اعزاز میں مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی نے ایک مشاعرہ کیا۔ منیر نے بھی غزل سنائی جس کا مقطع یہ ہے ؎

دنیا سے ہے باہر دل دیوانہ کسی کا ۔۔۔ بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

نواب موصوف اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ منیر کو اپنے ساتھ لکھنؤ لیتے آئے۔ یہاں ناسخ کا طوطی بول رہا تھا، نواب کی سفارش پر شیخ ناسخ نے، منیر کو اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔ اور جب ناسخ کو، حکیم مہدی کی وزارت کے عہد میں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو

---

[1] - دیباچہ منتخب العالم، منیر شکوہ آبادی، ص ۷۔
[2] - تقویم ہجری و عیسوی انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ص ۹۲ ۱۹۳۹ء۔
[3] - لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۴۲۵۔

ان کی خواہش پر، منیر، میر اوسط علی رشک سے اصلاح لینے لگے۔ منیر نے اپنے کلام میں جا بجا دونوں کی شاگردی پر فخر کیا ہے اور دونوں کے کمال فن سے مستفیض ہونے کا اعتراف کیا ہے ؎

برجِ علوم کے مہ کامل جناب رشک	تاریخ تھے آفتاب سپہر کمال کے
سمجھا گئے تمام مسائل جناب رشک	کیونکر نہ میری قدر زیادہ ہوئے منیر

منیر کی ساری زندگی کسی نہ کسی رئیس یا نواب کی مصاحبت میں بسر ہوئی۔ وہ نواب نظام الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے بعد نواب اصغر علی نے مصاحبت میں لے لیا۔ ابھی اطمینان نصیب نہ ہوا تھا کہ تیرہ بختی نے آگھیرا۔ مولانا احمد حسن خاں عروج نے قدردانی سے کام لیا۔ پھر سید محمد زکی خاں نے طلب کر لیا۔ اور اپنا استاد مقرر کیا۔ دو سال نواب صاحب کے ساتھ لکھنؤ کی رنگ رلیوں میں گزرے اسی درمیان نواب تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ[۱] کے بلانے سے انھیں فرخ آباد جانا پڑا۔ وہاں منیر کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کچھ دنوں بعد پھر لکھنؤ چلے آئے۔ بیکار دیکھ کر واجد علی شاہ نے سفر خرچ بھیج کر طلب کیا لیکن منیر نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب علی بہادر والیٔ ریاست باندہ نے انھیں ۲ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ ریاست باندہ میں انھوں نے کافی عرصہ قیام کیا اور ان کے دونوں دواوین 'منتخب العالم' اور 'تنویر الاشعار' وہیں مرتب ہوئے[۲] اور یہیں سے ان کی زندگی میں قید و بند کی مصیبتیں آئیں۔

منیر نے شعر و شاعری اور دلچسپ علمی مباحث سے نواب صاحب کو اس درجہ گرویدہ کر لیا تھا کہ ہر مسئلہ میں وہ منیر سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے، حتیٰ کہ ریاست

---

[۱] یہ وہی نواب تجمل حسین خاں ہیں۔ غالب نے جن کے لئے کہا تھا:
"بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے"

[۲] لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔

کے انتظامی امور میں بھی وہ کافی دخل رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جذبۂ آزادی نے ہر سینہ کو شعلہ زار بنا کر ہندوستان کو کوہ آتش فشاں بنا دیا تھا۔ آزادی کے پروانے دہلی اور شاہ دہلی پر نثار ہونے لگے۔ اور فرخ آباد، لکھنؤ، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور دوجانہ وغیرہ کے فرماں رواؤں نے انگریزوں کے خلاف میدان میں صف آرائی کی اور جب رانی جھانسی کے دلیرانہ کارناموں نے آگ لگا رکھی تھی تو نواب علی بہادر خاں بھی غیر جانب دار نہ رہ سکے انھوں نے تنیر اور اپنے وزیر ولایت حسین سے مشورہ کیے دونوں نے نبرد آزمائی کی ترغیب دی۔ چنانچہ فوجوں کو تیار کر کے نواب نے راج گڑھ کے قلعہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ تنیر نے فتح کی خوشی میں تاریخ کہی ؎

چو فوج بندیلہ بر باندہ رسید	ز حصن اجے گڑھ برائے فساد
بر ایشاں ظفر یافت نواب ما	دل اہلِ انصاف گردیدہ شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت تنیر	خدا فتح عالی بنواب داد[1] ۱۲۷۴ھ

دوسری جگہ کہتے ہیں:

عجب فتح دی میرے آقا کو حق نے	جبین ارادت ہے زیب مصلّیٰ
تنیر اس کی تاریخ میں نے رقم کی	ہے یہ فتح مفتاح کنز معلی ۱۲۷۴ھ

دوسری جگہ کہتے ہیں:

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو
سب عدو مقتول و بستہ زنجیر ہیں

آیا انا فتحنا مژدہ فتح قریب
تہنیت کے ہم زباں در دولت تقریر ہیں

فتح زیبا مبارک ہو، مٹا خار خلش
آپ منظور نگاہ مالکِ تقدیر ہیں

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری۔

۲۰ر اپریل ۱۸۵۸ء کو جب باندہ انگریزوں کے زیرنگیں آگیا نواب نے بھاگ کر کہیں پناہ لی اور ولایت حسین[1] اور منیر فرخ آباد سے مدد حاصل کرنے روانہ ہوئے لیکن راستہ ہی میں گرفتار ہو گئے۔ منیر کی جنگ میں شرکت اور ان کے قطعات انھیں دار و رسن کا سزاوار بنانے کے لئے کافی تھے۔ لیکن انگریزوں کو ایک اور بہانہ بھی ہاتھ آگیا۔ منیر کے دوستوں میں کوئی صاحب مصطفےٰ بیگ بھی تھے، انھوں نے ایک طوائف مسماۃ نواب جان کو قتل کر دیا تھا۔ سرکار نے مصطفےٰ بیگ کو سرکاری گواہ بنا کر منیر کو موردِ الزام ٹھہرایا اور ، سال کے لئے انڈمان بھیج دیا گیا[2]۔ منیر فرماتے ہیں:

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا ۔۔۔ زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لخت جگر کھانے لگی پیاس میں بھی ۔۔۔ کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

ایک اور قطعہ میں منیر نے ان تمام واقعات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں ۔۔۔ کج رووں میں بڑھ گئے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان ۔۔۔ مجھ کو بھی پھنسایا تزویر سے
خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال ۔۔۔ تھا جو میں ذریت شبیر سے
فرخ آباد اور یاران شفیق ۔۔۔ چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندہ سے مقید ہو کے ہم ۔۔۔ سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر ۔۔۔ تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے ۔۔۔ ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم ۔۔۔ ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں ۔۔۔ گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

---

[1] مرزا ولایت حسین کو سزا حبس دوام بہ عبور دریائے شور ہوئی اور انڈومان بھیج دیا گیا۔ (اردوئے معلی اپریل ۱۹۱۵ء) منیر شکوہ آبادی (از بدر لکھنوی (بہ حوالہ غدر کے چند علماء۔ از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ ص ۵۷)۔ [2] قند اردو، ترمیم شدہ ایڈیشن ص ۳۲۔

سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو، تشہیر سے [1]

منیر کی زندگی انڈمان میں کس طرح گزری، کیا کام ان کے سپرد تھا، ان کا زیادہ وقت کن مشغلوں میں گزرتا تھا اور ان کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی؟ ان تمام امور کا حال ان کے قطعات میں جابجا ملتا ہے انھیں پانی کھینچنے یا بیل گھوڑے باندھنے کا کام سپرد نہیں ہوا تھا اور نہ چکی کی مشقت ہی ان کے ذمہ تھی، بلکہ وہ کمشنر کے محکمہ میں منشی تھے۔ ظاہر ہے یہ کام ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ کہتے ہیں:

تھے قید ہم جزیرہ دریائے شور میں
نیرنگ گردشِ فلک نیل رنگ سے

منشی تھے محکمہ میں کمشنر کے ہم وہاں
محفوظ تھے مشقتِ بیل و کلنگ سے

پہلے یہ چھ روپے پر ملازم ہوئے تھے، پھر تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

پہلے ہوئی چھ روپے ہماری تنخواہ پھر آٹھ سے دس ہوئے خدا ہے گواہ
ننانوے کا پھیر رہا قید میں بھی لاحول ولاقوۃ الا باللہ [2]

کام کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

ہر چند محاسبوں میں کم وقعت ہیں پر قیدیوں کے کفیلِ کیفیت ہیں
لکھتے ہیں رہائی واسیری سب کی ہم نقل نویس دفترِ قسمت ہیں [3]

محکمہ کے کاموں سے فراغت ملنے کے بعد مولانا فضل حق خیر آبادی کی صحبت میں وقت گزارتے تھے یا پھر حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ وغیرہ کی شان میں قصیدے اور قطعات لکھتے تھے اور اپنی رہائی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ درد و یاس میں ڈوبی ہوئی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

---

[1] کلیات منیر، ص ۴۰۲۔ [2] کلیات منیر، ص ۴۰۴ و [3] کلیات منیر، ص ۴۰۴۔

جس روز سے دخل بے بسی نے پایا　　ہونٹوں کا نہ قرب ہنسی نے پایا
اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیرؔ　　ڈھونڈھا تو مجھی کو بے بسی نے پایا

مولانا فضل حق سے انھیں خاص عقیدت تھی۔ ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

رشک زلیخا ہوئی بحر صفت موجزن　　غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن
مخزن فضل و کمال عالم عالی مقام　　ناقد تازی زباں نکتہ شناس سخن
مولوی بے نظیر، فضل حق اسم شریف　　دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
قید میں ہیں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ　　عین سمندر میں تھے غرقہ بحر محن

نصف قصیدہ کیا شان میں ان کے رقم
ختم ہوا جب تو تھے ہمدم گور و کفن[1]

انڈمان کی آب و ہوا صحت کے لئے سخت مضر تھی۔ مختلف قسم کی بیماریوں نے وبائی شکل اختیار کر رکھی تھی، ان میں سے ایک بیماری خارش بھی تھی۔ منیرؔ نے خارش کے متعلق تین رباعیاں لکھی ہیں۔ ایک درج ذیل ہے:

پوچھے جو کوئی اسیر و بندہ کہنا　　بار غربت سے سر فگندہ کہنا
اے قاصد کہہ کے مجمل احوال منیرؔ　　خارش کا حال پوست کندہ کہنا[2]

اپنے طبیب حکیم محمد حسن خاں کو یاد کر کے لکھتے ہیں:

مرتا ہوں مصائب کی فراوانی سے　　صدمے ہیں رنج جسمی و جانی سے
افسوس ہے اس مریض کی حالت پر　　جو دور رہے طبیب روحانی سے

منیرؔ کے ایک دوست خوشی رام نے ۱۸۶۱ء میں ایک تاریخ انڈمان لکھی، تو منیرؔ نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا:

تصنیف کی جناب خوشی رام نے یہاں　　جان خرد کتاب ہے تاریخ انڈمن
دو داد ہے جزائر دریائے شور کی　　مطبوع شیخ و شاب ہے تاریخ انڈمن

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی نے ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو وفات پائی۔ [2] کلیات منیر ص ۴۹۸

موزوں کئے تیر نے یوں سال عیسوی

بحتا و لا جواب ہے تاریخ انڈمن [1]

تیر کو انڈمان میں گو جسمانی محنت و مشقت برداشت نہ کرنی پڑی تھی، لیکن عزیزوں سے جدائی اور لکھنؤ کی یاد ان کے دل پر تیر کا کام کرتی تھی۔ ان کے کلام میں اگر کہیں سوز و گداز ہے تو صرف ان چند رباعیوں، قطعوں اور تضمینوں میں ہے جو انھوں نے انڈمان کی اسیری میں کہے ہیں۔ ایک پر اثر درد انگیز تضمین دیکھئے

للّٰہ یا علی مری امداد کیجئے

ظاہر کمال رحم خدا داد کیجئے — قید ملال و رنج سے آزاد کیجئے
برباد ہے غلام اب آباد کیجئے — گھبرا رہا ہوں جلد مجھے شاد کیجئے

للّٰہ یا علی مری امداد کیجئے

اہل زمانہ کو مری ایذا پسند ہے — مدت سے مضطرب ہوں رہ چارہ بند ہے
چاروں طرف حصار مصائب بلند ہے — تعویذ کارگر نہ عمل سود مند ہے

للّٰہ یا علی مری امداد کیجئے

یک بار جس نے آپ سے امداد کی طلب — فوراً مدد کی آپ نے اے سرور عرب
سوئے نجف پکار رہا ہوں میں روز و شب — کی آج تک حضور نے تاخیر لیکن اب

للّٰہ یا علی مری امداد کیجئے [2]

آخر کار تیر کی دعا قبول ہوئی اور ۱۸۶۵ء میں انھیں رہا کیا گیا کلکتہ کو واپس جاتے ہوئے لکھتے ہیں :

بارے آئی نجات کی باری — کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا — قید کو جائیداد بیکاری
کوچ ٹھہرا مقام غربت سے — اب وطن چلنے کی ہے تیاری

---

[1] کلیات تیر ص ۲۷۱ [2] کلیات تیر ص ۲۰۲

رخصت اے دوستانِ زندانی   الوداع اے غم گرفتاری
الرحیل اے دوستانِ زندانی
الفراق اے ہجومِ ناچاری

دال چاول سے کہدو رخصت ہوں   پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
مچھلیوں سے کہو کہ سٹ کے سڑیں   گھاس کھودیں یہاں کی ترکاری
چینی، برمی، ملائی، مدراسی   اہلِ آسام، جنگلی، تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں   اپنی باتوں سے دیں سبکساری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت   اشکِ شادی ہیں آنکھوں سے جاری
نکلے دریائے شور سے صد شکر   بحرِ شیریں کی آ گئی باری
نظر آیا، سوادِ کلکتہ   شکر ہے، شکرِ حضرتِ باری
کیا منیرؔ اور التماس کرے
فکرِ قاصر ہے نطق سے عاری

ایک اور مقام پر اپنی رہائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیرؔ   فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں   اے خدا ہندوستان کا اب سفر مسعود ہو
آکے بیٹھا ہوں جہاز تیز رو پر شکر ہے   لنگر اٹھا ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہو
مادہ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے   نیک ساعت ہو، کواکب کی نظر مسعود ہو
آج کے دن کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی
روزِ سہ شنبہ ہشتم ماہ صفر مسعود ہو[1] (۱۲۸۲ھ)

اپنی رہائی کے متعلق منیرؔ نے ایک اور جگہ کہا ہے:

---

[1] کلیاتِ منیرؔ ص ۴۹۹

انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس　　شکر خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے
ہندوستاں میں آکے رہے ہم پراگ میں　　اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے

فضل خدا سے سال رہائی کہو منیر
اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قید فرنگ سے

کہا جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں (رام پور) کے ہاں ایک دن محفل رقص و سرود منعقد تھی ایک گویے نے منیر کی مشہور غزل "شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے" سنائی۔ نواب صاحب اس غزل کو سن کر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اس زمین میں ایک غزل کہی۔

"ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"

لیکن جب انھیں یہ علم ہوا کہ منیر کو عبور دریائے شور کی سزا ہو گئی ہے تو انھوں نے حکومت سے منیر کی رہائی کی سفارش کی۔ منیر صفر کی ۹ تاریخ روز سہ شنبہ رہا ہو کر آئے تو انھیں نواب صاحب کی تاثر پذیری کا علم ہوا۔ انھوں نے نواب صاحب کے مصرعہ

"شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"

پر تضمین کی اور نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی پر قصیدہ بھی کہا[1]، اور انھیں پیش کیا۔ منیر کو نواب صاحب نے بلا لیا۔ منیر نے اس تضمین میں تمام روداد پر روشنی ڈالی ہے۔

---

[1] قید سے رہائی پاکر منیر الہ آباد پہنچے تھے اور وہیں سے نواب صاحب کے شعر کا جواب لکھا۔ منیر ان کی غزل کو تخمیس کر کے ارسال کیا۔ جس کے مقطع میں نواب صاحب کے مقطع کا جواب ہے۔ ان کے قدرداں ہونے کا اعتراف اور اپنے آنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ بند یہ تھا

مشہور خلق آپ کی ہیں قدردانیاں　　حسب طلب منیر بھی آتا ہے اب وہاں
یہ حکم خاص ہے دل رجال پہ حرز جاں　　ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ پر)

منیر رام پور پہنچ گئے۔ نواب کلب علی خاں نے قدردانی کی اور ان کی زندگی سکون و اطمینان سے بسر ہونے لگی۔ آخر عمر تک منیر وہیں رہے۔ اور ۱۲۹۷ھ (مطابق ۱۸۷۹ء) میں رام پور ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ "انتقال منیر عالی قدر" (۱۲۹۷ھ) سے ہجری سال وفات اخذ ہوتا ہے۔

منیر نے لکھا ہے کہ "اگر میرا تمام سرمایہ کلام زمانہ کی دست برد سے محفوظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ) ایک دوسرے بند میں کہتے ہیں:

چل اے منیر قبلۂ عالم ہیں قدرداں　　بولتے ہیں حضور معظم ہیں قدرداں
وہ کہتے ہیں جو آج مسلم ہیں قدرداں　　"ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
"شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"

غرض کہ منیر رام پور جانے کے خیال سے لکھنؤ آئے، یہاں ان کو نواب کے انتقال کی خبر ملی عالم حزن دیا س میں ایک بند کا اضافہ کیا:

آیا منیر چھوٹ کے جب قید سے یہاں　　تھا قصد رام پور کا ہو جاؤں میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں　　اب کس کے پاس جاؤں ہے کون قدرداں
نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے

منیر پہلے سے پریشان حال تھے اس حادثہ نے انھیں نڈھال کر دیا اور وہ مایوس ہو گئے اتنے میں ولی عہد رام پور کی تخت نشینی کی خبر آئی، امیدوں نے پھر انگڑائی لی اور تہنیت نامہ مع تاریخ کہا۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

نواب پاک کلب علی خاں بنے امیر　　بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں
صد شکر آئے راہ پہ اب طالع فقیر　　ہے قدرداں سراپا امیر فلک سریر
اب سرخرو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

اس کے بعد منیر کی زندگی سکون و اطمینان سے بسر ہونے لگی۔

رہتا تو ، ۱۰ دیوان مکمل ہو گئے ہوتے۔ گو بعض حضرات کو میرے اس دعوے میں شک ہے۔" یہ دعویٰ منیر نے "منتخب العالم" کی اشاعت کے وقت کیا تھا جب کہ ان کی عمر صرف ۳۵ برس کی تھی۔ اس وقت وہ شاعری کے علاوہ رسالہ "اعلانِ حق" "سراج المنیر" اور رسالہ "تنبیہہ الشائقین بہ فضائل الثقلین" بھی تصنیف کر چکے تھے رہائی کے بعد ایک مثنوی "معراج المضامین" اور ایک دیوان "نظم منیر" اور شائع ہوا۔ اس طرح ان کا تمام سرمایۂ فکری ، بیس پچیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جو کچھ ضائع ہو گیا اس کا شمار نہ ہو سکا۔

فضل حق خیرآبادی

مولانا فضل حق ان مجاہدین میں سے ہیں جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بے خطر کود پڑے تھے انھوں نے صرف لب بام سے تماشا نہیں دیکھا تھا۔ انھیں راستے کی دشواریوں کا پورا پورا احساس تھا لیکن جن روایات میں ان کی نشو ونما ہوئی تھی وہ ان سے منحرف نہیں ہو سکتے تھے۔ سر دار بھی اعلانِ حق سے انھیں پس و پیش نہ تھا۔ انھوں نے ہر ظلم و ستم برداشت کیا لیکن جو قدم اٹھا چکے تھے، انھیں پیچھے نہ ہٹایا اور جو کہہ چکے تھے اس پر آخر دم تک قائم رہے۔

مولانا، برِ عظیم کے ان چند علماء میں تھے، جن کی خانقاہیں اور حلقہ ہائے درس مذہب، علم، سیاست اور شعر و ادب کی پرورش گاہیں تھیں۔ انھیں گہواروں میں سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید نے پرورش پائی تھی اور انھیں میں ہزاروں مجاہدین نے پرورش پائی اور تربیت حاصل کی، جس کے خون سے وطن کا ذرہ ذرہ آج بیبراب ہے:

"مولانا فضل حق خیرآبادی مشہور ہیں، ان کے مورث اعلیٰ شیر الملک بن عطا الملک فاروقی تھے۔ یہ خاندان ایران کے ایک حصہ کا فرماں روا تھا۔ ان کے صاحبزادے ایران سے ہندوستان آئے اس خاندان کی نجابت و شرافت تحصیل علم کی داستانیں تاریخوں اور تذکروں میں عام ہیں انھیں میں ملا ابو الواعظ بھی تھے جو اورنگ زیب کے اتالیق اور فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں سے ہیں۔

"مولانا فضل حق کے والد مولانا فضل امام بن شیخ ارشد اپنے عہد میں مشہور عالم و فاضل تھے، نو عمری میں دہلی آئے اور صدر الصدور

کے عہدہ پر فائز ہوئے ساتھ ہی درس و تدریس کا حلقہ تھا جہاں علم کے متلاشی دور دور سے آتے تھے۔ ان کی تصانیف میں تلخیص الشفاء اور حاشیہ افق المبین وغیرہ ہیں[۱]۔"

"مولانا فضل حق خیرآبادی، عمری، حنفی، ماتریدی چشتی ۱۲۹۲ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔[۲]"

امراء کے بچوں کی طرح تعلیم و تربیت کا انتظام ہوا۔ والد ماجد کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ انھیں فضل و کمال کے ساتھ منطق و فلسفہ میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ حدیث کے لئے مولانا شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد ہوئے تین سال کی عمر میں اتنی لیاقت حاصل کرلی کہ جو طالب علم ان کے والد کے پاس آتے تھے وہ ان کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا فضل حق دلّی سے ریذیڈنٹ کے سررشتہ دار ہوگئے، ترقی کر کے کمشنری میں گئے اسی زمانہ میں کول بروک کلکتہ سے ریذیڈنٹ ہوکر دلّی آیا تو اس نے مولانا کو محکمہ کا ناظم بنادیا۔ ۱۸۲۸ء میں دہلی کے محکمہ قضاۃ میں مفتی ہوگئے۔

شعر و شاعری کا ذوق فطری تھا۔ مومن، غالب، آزردہ سے صحبت تھی۔ خود عربی میں کہتے تھے اور چار ہزار سے زیادہ اشعار کہے۔ کلام کا بیشتر حصہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہے اور طبع نہیں ہوا۔ کچھ مطبوعہ کلام پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ مگر نایاب ہے۔

اپنے کارناموں اور علمی و ادبی فضائل سے قطع نظر مولانا نے جنگ آزادی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے، وہ زمانہ سیاسی ابتری، خلفشار کا زمانہ تھا۔ سلطنت مغلیہ کی زوال

---

[۱] مولانا فضل حق خیرآبادی۔ از ابواللیث صدیقی۔ سن ستاون میری نظر میں مرتبہ ناصر کاظمی، انتظار حسین، ص ۲۶۱۔

[۲] تذکرہ علمائے ہند تالیف مولوی رحمان علی ترجمہ محمد ایوب قادری ص ۳۸۲۔

تھی مسلمان دینی، تعلیمی، مذہبی اور معاشی حیثیت سے زیر ہو رہے تھے ان حالات میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جو فضل حق کے استاد تھے، ہندوستان کو دار الحرب قرار دے دیا۔ کسی ملک کے دار الحرب قرار دینے کے بعد مسلمانوں کے لئے دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ وہاں سے ہجرت یا جہاد۔ جہاد افضل ہے۔ ایک جماعت نے یہی صورت اختیار کی جس کا نتیجہ سید اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق کی تحریک حریت جہاد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ممکن تھا کہ یہ تحریک کچھ کامیاب ہوتی لیکن انگریزوں کی سازش، بعض جماعتوں کی سازباز اور خود مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کی بدولت پروان نہ چڑھی۔

"بالاکوٹ کے میدان کی خاک کے ذرّے ذرّے میں آج بھی ان کے خون کی حرارت اور گرمی موجود ہے۔ ان ذروں میں زندگی، عزم اور استقلال کے طوفان پوشیدہ ہیں جو ہر لمحہ پھوٹ پڑنے کے لئے بے چین ہیں ...." [۱]

مسلمانوں کے سامنے صرف ہجرت کی شکل باقی رہ گئی تھی چنانچہ مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث، مولانا محمد یعقوب اور دیگر مجاہدین ہجرت کر گئے لیکن بڑے پیمانہ پر ہجرت ممکن نہ تھی اس لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جو جابر حکومت کے سامنے 'کلمۃ الحق' کے اعلان سے 'افضل الجہاد' کی شان قائم کرے۔ یہ کام مولانا فضل حق نے کیا۔

مولانا نے ملازمت ریزیڈنسی میں سررشتہ داری سے شروع کی تھی لیکن حالات کا رخ دیکھ کر وہ کمپنی کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر نے ۵۰۰ روپے ماہوار مصارف کے لئے پیش کئے اور اپنے پاس بلا لیا پھر مہاراجہ لاہور کے پاس چلے گئے اور پھر ٹونک، سہارنپور، رام پور، اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ ۱۸۵۵ء میں جب نواب یوسف علی خاں تخت نشین ہوئے تو آپ رام پور میں تھے۔ غالب کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوائل ۱۸۵۷ء تک وہیں تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ذہنی تیاری بڑے عرصے سے ہو رہی تھی اور علماء اس آزمائش میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔ ان علماء کا مقصد یہ تھا کہ بالاکوٹ

کے حادثہ سے پیدا شدہ خوف دہراس دور کیا جائے، مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بتانے کے لئے جان قربازی لگانے پر آمادہ کیا جائے چنانچہ باقاعدہ فتویٰ جہاد جاری کیا گیا جس پر دستخط کرنے والوں میں آزردہ اور مولوی فضل حق بھی تھے مولانا نے فتوے کے بعد جگہ جگہ دورے بھی کئے اور آخر میں دہلی پہنچے۔

"اس زمانہ میں ان کی سرگرمیوں کا اندازہ جیون لال کے روزنامچہ سے ہوتا ہے اس نے مختلف تاریخوں میں مولانا کا قلعہ کی مجلس مشاورت میں شریک ہونا بیان کیا ہے"[1]

مولانا کے مشورے صرف قلعہ معلیٰ کی پوشیدہ سرگرمیوں تک محدود نہ تھے، وہ جنرل بخت خاں سے بھی ملے، مشورے ہوئے اور آخر بعد نماز جمعہ دلی کی لال مسجد میں فضل حق نے علماء کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔ دستخط کرنے والوں میں آزردہ اور فضل حق کے علاوہ مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رام پوری بھی شریک ہوگئے۔ اس فتوے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ ہزار کی فوج دلی میں جمع ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ برّ عظیم کی قسمت پلٹنے والی ہے لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا یہ شعلہ بھڑکا اور بھڑک کر بجھ گیا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا مکان اور کتب خانہ ضبط ہوا گرفتار کر کے لکھنؤ لائے گئے۔ اور لوگ بھی پکڑے گئے۔ مفتی صدر الدین یہ کہہ کر چھوٹ گئے کہ میں نے فتویٰ بالجبر لکھا۔ شیفتہ کو معافی مل گئی۔ فضل حق عدالت کے روبرو پیش ہوئے۔ جس گواہ نے مخبری کی تھی، وہ ان کی بزرگی اور تقدس دیکھ کر گھبرا گیا اور کہنے لگا۔" وہ کوئی دوسرے فضل حق تھے یہ نہیں ہیں۔" مولانا پاس کھڑے تھے، مسکرائے اور کہنے لگے۔" پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی اب عدالت

---

[1] فضل حق خیرآبادی۔ از ابوالیث صدیقی دکن ستاون میں نظر میں ، ص ۲۰۲۔

میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا ہے اور جھوٹ بولا ہے۔ وہ فتوی صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت تک بھی میری وہی رائے ہے[1]

مولانا کی یہ جرأت اور اعلان کلمۃ الحق جنگ آزادی کی تاریخ ہی میں نہیں دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ چنانچہ مقدمہ ان کے خلاف فیصل ہوا۔ البتہ پھانسی کے بجائے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی اور انڈمان بھیج دیئے گئے۔

"انگریزوں نے ان کو فساد ہند ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں قید کر کے رنگون[2] بھیج دیا۔ وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں فوت ہوئے۔

صاحب تذکرۂ علماء ہند کی یہ رائے کہ مولانا فضل حق جزیرہ رنگون بھیجے گئے تھے، کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مولانا قید کر کے جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تھے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کی لیاقت و کردار سے متاثر ہو کر انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ نے ان کی رہائی کی سفارش کی تھی ادھر ان کے صاحبزادے عبد الحق اور دیگر روسائے لکھنؤ نے بھی کوششیں کیں لیکن جب پروانہ رہائی وہاں پہنچا تو شہر سے ایک جنازہ گزر رہا تھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مولانا فضل حق تھے جو قید حیات اور قید فرنگ دونوں سے آزاد ہو گئے تھے۔

انڈمان و نکوبار میں

انڈمان نکوبار کے زمانہ قیام میں علامہ خیر آبادی کی دو چیزیں یادگار ہیں:

(الف) الثورۃ الہندیۃ

(ب) قصائد فتنۃ الہند

"یہ دونوں تخلیقات تاریخی ہونے کے علاوہ ادبی قدر و قیمت بھی رکھتی ہیں اشعار

---

[1] یہ حوالہ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

[2] تذکرہ علمائے ہند۔ تالیف مولوی رحمان علی ص ۲۸۲ ترجمہ محمد ایوب قادری

اور جملوں میں ایک مادے کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں یہ رسالہ اور قصیدہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابل قدر ماخذ ہیں۔ ان میں علامہ نے ایجاز و اختصار سے ضروری حالات و واقعات پیش کئے ہیں اور وہاں کے مصائب و آلام کو موثر انداز میں بیان کیا ہے[1]۔

یہ رسالہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعے سے علامہ کے صاحب زادے کو ملے اور انھیں مولوی عبدالشاہد شیروانی نے اردو ترجمہ کے ساتھ "الثورۃ الہندیہ" (باغی ہندوستان) کے نام سے ۱۹۴۷ء میں طبع و شائع کردیے ہیں۔

مولانا شیروانی نے کتاب کے شروع میں مولانا فضل حق اور ان کے سلسلے کے ممتاز علماء کے مفصل حالات بھی شامل کر دیے ہیں اس رسالہ اور قصائد کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر معین الحق صاحب نے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جرنل (جنوری ۱۹۵۷ء) میں شائع کر دیا ہے۔ محمد ایوب قادری صاحب کا کہنا ہے کہ: "مولوی غلام علی مہر نے اپنی تالیف "دیوبندی مذہب" میں بھی "الثورۃ الہندیہ" کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے مگر شیروانی کے ترجمہ کا کہیں ذکر نہیں ہے[2]"۔

قصائد و رسالے کے چند اقتباسات یہاں دیے جا رہے ہیں:

"میری یہ کتاب ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے، جو اب تھوڑی سی تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اب رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے، مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے۔ جو ابتدائے عمر سے عیش و فراغت

---

[1] جزائر انڈومان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات۔ از محمد ایوب قادری (رسالہ، اردو جنوری ۱۹۶۳ء ص ۶۲)۔ [2] جزائر انڈومان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات از محمد ایوب قادری (رسالہ اردو جنوری ۱۹۶۳ء ص ۶۳)۔

کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اب محبوس، دامِ ظلم، اور تباہ ہے اور مقبول دعاؤں کے ذریعہ سے خدا سے ازالہ کرب کا طالب ہے۔ وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترش رو ظالموں کے ہاتھ میں گرفتار ہے ان ظالموں نے اسے مناسب لباس سے مبرا کر کے غم و حزن کی وادیوں میں ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈالا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں وہ ایک سیدھا سادا اور نرم خو مریض و کمزور شدید و بدفطرت کی قید میں ہے۔ ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران پریشان ہے۔ اپنے تمام اعزہ واقربا سے دور اور بہت دور ہے۔ اس کے بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ غم زدہ تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین اور شہر سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اہل و عیال سے دور کر دیا گیا ہے اسے قید کر کے ہر ممکن تکلیف اور مصیبت پہنچائی گئی ہے۔ اس کا قصور صرف ایمان اور اسلام اور علماء اسلام میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے۔ یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ کی وجہ سے ہوا ہے جس نے آبادیوں کو ویران اور مصیبتوں کی شور زمین کو شاداب بنایا ہے، جس سے غموں کے بادلوں کی کڑکتی بجلیاں مصیبت زدگان پر گریں اور ان پر بادشاہوں کو غلام و قیدی اور امراء کو محتاج و فقیر بنانے والی ناداری و محتاجی مسلّط کر دی گئی۔"

مولانا فضل حق سے یہ خوں چکاں داستان عبرت خیز بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ وہ ایک مرد صاحب دل تھے جنھیں زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے اور جو مر کر بھی حیات ابدی حاصل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔۔۔۔

"(مؤلف) سخت دل، اچکّے اور ظالم افراد۔۔۔۔ شریر و بدفطرت

کی قید میں ہے ...... اور ظالم وجابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے ...... وہ سیاہ رو، سیاہ دل، متلون مزاج ترش رو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوں کی قید میں آچکا ہے ...[۱]

"یہ سارا ظلم وستم ظالم و بدکیش نے روا رکھا ہے۔ اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے ......"[۲]

ملکہ وکٹوریہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"ان تمام فتح مندیوں کے بعد بھی ملکہ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی اس مکر کی وجہ سے انھیں بڑی قوت وطاقت حاصل ہوگئی۔"[۳]

"مجھے ایک عورت (وکٹوریہ) کے مکر نے مبتلائے مصیبت کردیا۔ عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے۔"[۴]

قصیدے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"بہت سے سفید رنگ، شراب خور اور میگوں مونچھوں والے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں۔"

"وہ سیاہ جگر، سفید فام، نرم جلد، سخت قلب واقع ہوتے ہیں۔"

"وہ بدبخت و بے شرم ہیں، انھیں نہ ننگ وعار ہے نہ غیرت علم وحیا ان کے پاس ہوکر گزری ہے۔"

"بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں ان میں نرمی اور سادہ حمایت وحمیت نام کو نہیں۔"

---

[۱] [۲] [۳] [۴] الثورۃ الہندیہ ص ۲۵۲، ۲۵۴۔ ۲۵۵، ۲۱۳، ۲۳۶۔

——— "سارے عیوب ان میں موجود ہیں، مردوں میں سرکشی، عورتوں کی حرام کاریاں، فسق و فجور کی اشاعت ہے۔"

——— "ان سب کی بدمعاشیاں، مردوں کی سرکشیاں، عورتوں کی حرام کاریاں فسق و فجور کی اشاعت اور کثرت کا سبب بنی ہوئی ہیں۔"[1]

یہ چند اقتباسات بطور مشتے از خروارے ہیں ورنہ اس رسالہ اور قصائد کی زبان، لہجہ اور انداز بیان نہایت سخت ہے۔ علامہ فضل حق نے ان تحریرات میں انگریزوں کی چالاکیوں، مکاریوں، ظلم و ستم، سیاسی بے ایمانیوں اور بدعہدیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ قید و بند کی انتہائی صعوبتوں کے عالم میں بھی وہ حق بات کہنے سے باز نہیں رہے۔ برطانوی غلامی سے آزادی اور وطن سے محبت کا پاک جذبہ یہاں بھی ان کی تحریروں میں روح بن کر دوڑتا ہے۔ عربی زبان و ادب کے ناقدین کا کہنا ہے کہ ان قصائد میں مولانا کے احساسات کی شدت اور صداقت نے غضب کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ عربی زبان اور فن شاعری پر یہ مولانا کی بے مثل قدرت کا ثبوت ہے۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ، ص ۴۳۹۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی

مفتی عنایت احمد کاکوروی بن منشی محمد بخش کی ولادت ۹ر شوال ۱۲۲۸ھ (۱۵ر اکتوبر ۱۸۱۲ء) میں ہوئی [۱]۔ تحصیل علم کے لئے رام پور گئے جہاں سید حیدر علی سے تعلیم حاصل کی پھر دہلی جا کر علم حدیث شاہ محمد اسحٰق (ف ۱۲۶۲ھ) سے پڑھا۔ بعد ازاں علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی سے تکمیل تعلیم کی پھر حکومت انگلشیہ میں ملازم ہو گئے۔ مفتی اور منصف کے عہدے پر فائز رہے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کے تلامذہ میں منشی لطف اللہ علی گڑھ (ف ۱۹۱۶ء) اور مولانا حسین شاہ بخاری وغیرہ مشہور ہیں۔ مفتی صاحب نے متعدد تبلیغی و اصلاحی رسالے لکھے۔ ان کی کتابوں میں علم الفرائض، ملخصات، ضمان الفردوس، فضائل درود و سلام، بیان شب قدر و شب برات، رسالہ در مذمت حیلہ ہا، احادیث حبیب الکریم اور نقشہ مواقع النجوم وغیرہ مشہور ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مفتی صاحب کی تمام کتابیں اردو زبان میں ہیں [۲]۔

مفتی عنایت احمد، بریلی میں صدر امین تھے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب شروع ہو گیا نواب خان بہادر خان روہیل کھنڈ کے ناظم مقرر ہوئے۔ نواب خان بہادر کی مالی امداد کے لئے مفتی صاحب نے فتویٰ دیدیا [۳]۔ جب انگریزی حکومت کا بریلی میں دوبارہ

---

[۱] ۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ غلام رسول مہر، ص ۳۱۶۔

[۲] ماخوذ از تذکرہ مشاہیر کاکوری از محمد علی حیدر، ص ۲۹۰ — ۹۸۹

[۳] Freedom struggle in U.P. Vol V P.P. 170-175

قبضہ ہوا تو کاغذات میں مفتی صاحب کا فتویٰ برآمد ہوا۔ اور اس جرم میں انھیں حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔

انڈمان کی زندگی :-

انڈمان میں مفتی عنایت احمد صاحب کے پاس کوئی کتاب نہ تھی تاہم حافظہ کی بنا پر علم الصیغہ، تواریخ حبیب الہ، ترجمہ تقویم البلدان تصنیف کیں۔[۱]

علم الصیغہ ـــــ عربی صرف کا مشہور رسالہ ہے جو آج تک کورس میں داخل ہے۔ انھوں نے یہ رسالہ ایک صاحب حافظ وزیر علی کی فرمائش پر لکھا تھا وہ لکھتے ہیں :

"ایں رسالہ ایست در علم صرف کہ بہ پاس خاطر شفیق محسن مجمع محاسن حافظ وزیر علی صاحب بہ جزیرہ انڈمین بمعرض تحریر در آمد۔ درود حقیر در آں جزیرہ از نیرنگ تقدیر بودہ و کتابے از ہیچ علم نزد خود نداشت ایں رسالہ را بوضع نگاشت کہ بجائے میزان و منشعب و پنج گنج و صرف میر بکار آید و بر فوائد دیگر ہم مشتمل باشد"۔[۲]

کتاب کا خاتمہ چند فوائد پر مشتمل ہے جس کو 'قوانین جزیلہ حافظیہ' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۷۶ھ میں تصنیف ہوئی۔

تاریخ حبیب الٰہ :- ۱۲۷۵ھ میں حکیم امیر خاں نیٹو ڈاکٹر انڈمان کی خواہش پر مفتی صاحب نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مبارکہ پر یہ کتاب لکھی۔ یہ تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ باب اول میں ولادت مبارکہ سے ہجرت تک کے واقعات، دوسرے باب میں ہجرت سے وفات تک اور تیسرے باب میں حلیہ شریف، اخلاق کریمہ اور معجزات کا ذکر خیر ہے۔ یہ کتاب محض یادداشت پر لکھی ہے۔ وطن واپس آنے کے بعد اصل سے ملایا تو فرق نہ پایا۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں :

---

[۱] ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۳۱۶۔

[۲] علم الصیغہ از مفتی عنایت احمد، ص ۲، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۹ھ

"راقم الحروف بزیر نمٹ تقدیر سے فی الحال جزیرہ پورٹ بلیر میں وارد ہے اور کوئی کتاب کسی طرح کی اپنے پاس نہیں رکھتا ہے بپاس خاطر شفیق و غم گسار و مصدر عنایات بر حال زار حکیم امیر خاں صاحب نیٹو ڈاکٹر کے یہ رسالہ بیان "تواریخ حبیب اللہ صلعم" میں ۱۲۷۵ھ میں لکھتا ہے اور نام تاریخی اس کا "تواریخ حبیب اللہ" ہے۔"[1]

شمالی ہندوستان میں اردو زبان میں سیرت پاک پر یہ پہلی قابل ذکر کتاب ہے۔

ترجمہ تقویم البلدان:۔ دور اسیری میں مولانا کی تیسری اہم کتاب (عربی کی ضخیم کتاب تقویم البلدان کا ترجمہ ہے جو ایک انگریز کی فرمائش پر کیا گیا اور دو برس میں مکمل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی ترجمہ رہائی کا سبب بنا اور ۱۲۷۷ھ میں مفتی صاحب رہا ہوئے۔[2] مفتی صاحب کے شاگرد لطف اللہ علی گڑھ نے تاریخ رہائی لکھی اور خود کاکوری جاکر انھیں پیش کی۔

چوں بہ فضل خالق ارض و سما	اوستادم شد ز قید غم رہا
بہر تاریخ خلاص آں جناب	بر نوشتم آن استاذی بجا[3] (۱۲۷۷ھ)

انڈمان سے واپس آکر مفتی صاحب کا قیام کان پور میں رہا۔ اور وہاں انھوں نے مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ اور اصلاحی اور تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ ۱۲۷۹ھ میں حج کے لئے تیار ہوئے۔ بمبئی سے جہاز پر چلے جدہ کے قریب پہنچے تو جہاز ایک پہاڑی سے ٹکراکر پاش پاش ہو گیا۔ اور مفتی عنایت احمد بحالت نماز، احرام باندھے ہوئے غریق و شہید ہوئے۔ ۷ر شوال ۱۲۷۹ھ (۷ر اپریل ۱۸۶۳ء) کا واقعہ ہے۔

---

[1] تواریخ حبیب الہ۔ مفتی عنایت احمد، ص ۲-۳ (طبع کان پور)

[2] قیصر التواریخ، ج ۲، ص ۳۶۱

[3] استاذ العلماء (سوانح عمری مفتی لطف اللہ علی گڑھی) از مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی ص ۱۱

تذکرہ مشاہیر کاکوری میں لکھا ہے:

"یہ نہایت متقی و متورع و متبحر فاضل تھے۔ علماء ربانیین میں شمار کیے جاتے تھے۔"[1]

---

[1] تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۲۹۶۔

محمد جعفر تھانیسری

مولوی محمد جعفر تھانیسری، تھانیسر میں تقریباً ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے
راعین قبیلہ کے چشم و چراغ تھے۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے خاص رکن تھے
اور بڑے زردار تھے۔ معرکۂ امبیلا کے بعد ان پر بغاوت اور سازش کے الزام میں
مقدمہ چلا جائداد ضبط ہوئی اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔ ۱۱ر
جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا محمد جعفر انڈمان پہنچے۔ اور چیف کمشنر کے دفتر میں نائب میرمنشی
ہو گئے۔ یہاں از سر نو زندگی کا آغاز ہوا۔ ان کی عمر ۲۷ برس کی تھی۔ کم و بیش ۱۸ سال
انھوں نے وہاں گزارے اور ۹ر نومبر ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے روانہ ہو کر ۲۰ر نومبر ۱۸۸۳ء
کو انبالہ چھاونی پہنچے اور ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔[۵۱]

جعفر تھانیسری نے نصائح جعفری، سوانح احمدی، رسالہ رد قادیانیت، ترجمہ
آئین پورٹ بلیر (تاریخ عجیب)، اور کالا پانی (تواریخ عجیب) کتابیں لکھیں۔ آخری تین
کتابیں انڈمان کی اسیری کے دوران تصنیف کیں۔

ترجمہ آئین پورٹ بلیر:۔ جزائر انڈمان و نکوبار کے ڈپٹی کمشنر میجر پراتھر
نے پورٹ بلیر کے آئین پر ایک کتاب مرتب کی اس کی تیاری میں جعفر تھانیسری نے
پوری مدد کی اور خود اس کا ترجمہ بھی کیا۔[۵۲]

۵۱۔ ماخوذ از تواریخ عجیب مرتبہ محمد ایوب قادری، ص ۲۱-۵۲
۵۲۔ تاریخ عجیب، ص ۲

تاریخ پورٹ بلیر (تاریخ عجیب):۔ اس کتاب کا تاریخی نام تاریخ عجیب ہے یہ کتاب اپریل ۱۸۷۵ء میں مکمل ہوئی۔ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جزائر انڈمان دنکوبار کے حالات و واقعات سے متعلق ہے، دوسرے حصہ میں ان جزائر میں مروجہ ۳۲ مشہور زبانوں کے روزمرہ کی ضروریات کے چھوٹے چھوٹے جملے اور اسماء خالق باری کے طرز پر اردو جملوں کے ساتھ لکھے ہیں۔

انھوں نے یہ کتاب سردار بھگیل سنگھ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر اوران کے بیٹے کی فرمائش پر لکھی تھی پہلی بار ۱۸۸۰ء میں نول کشور لکھنؤ سے چھپی۔ ابتدائیہ اور پیش لفظ انگریزی میں ہے۔ سبب تالیف بتاتے ہوئے جعفر تھانیسری لکھتے ہیں

"مدت دراز سے بہت صاحب لوگوں کی جو مجھ سے اردو ناگری فارسی سیکھتے تھے یہ فرمائش تھی کہ اردو مروجہ پورٹ بلیر میں کوئی ایک کتاب تصنیف کی جائے کہ جس سے یہاں کے لوگوں کو اردو سیکھنے میں مدد ملے اور اس کے سوائے اور بہت سے دوستوں کی مدت سے یہ تمنا تھی کہ ایک کتاب تاریخ پورٹ بلیر جس میں یہاں کی آبادی اور اوضاع واطوار و بندوبست و قانون و زبان مختلف پورٹ بلیر و حال جنگلاں جزائر ہذا کا مفصل درج ہو۔ تصنیف کر کے بغیر حاضر اور ہند کے لوگوں کو بھی یہاں کے عجائبات سے آگاہ کیا جاوے۔ سو ان دونوں غرضوں کے رفع کے واسطے اس خاکسار محمد جعفر میر منشی اور سدرن ڈسٹرکٹ نے یہ مختصر کتاب تحریر کر کے اس کا تاریخی نام 'تاریخ عجیب' رکھ دیا۔[۵]"

یہ کتاب چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں جزائر کے محل وقوع، آبادی، جغرافیائی حالات، مقامی باشندوں نیز دوسرے عجائبات کا ذکر، دوسری فصل میں انتظامی امور، جزائر انڈمان پر قبضہ کرنے سے تدوین کتاب تک، سپرنٹنڈنٹوں کی تقرری، عہد کے خاص خاص واقعات اور ان کی انتظامی اور آئینی کارگزاریوں کا ذکر ہے۔ تیسری فصل میں

---

۵ تاریخ عجیب، ص ۲-۴ مصنفہ محمد جعفر تھانیسری مرتبہ محمد ایوب قادری

گورنر جنرل لارڈ میو کے قتل کے چشم دید حالات، چوتھی فصل میں مروجہ دستور العمل اور قوانین کا ذکر ہے۔ پانچویں فصل میں جزائر انڈمان نکوبار کی مروجہ زبانوں اور وہاں کے باشندوں کا طرز معاشرت اور عادات و اطوار کا بیان ہے۔ چھٹی فصل نہایت مختصر ہے جس میں قیدیوں کے عجیب و غریب نام انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ آخر میں مختصر سی فرہنگ بھی شامل ہے۔

تواریخ عجیب (کالا پانی):۔ تاریخ نامی تواریخ عجیب ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب تاریخ پورٹ بلیر کا دوسرا حصہ یا تتمہ ہے۔ جب ۱۸۸۴ء میں مولوی جعفر انڈمان سے واپس آئے تو احباب و اعزہ نے اس طویل زمانۂ اسیری کے حالات معلوم کئے انہوں نے اس مختصر سی کتاب میں اپنی گرفتاری، مقدمہ، قید، سفر، انڈمان کی زندگی اور رہائی کے حالات و واقعات نہایت دل چسپ انداز میں لکھ دیے ہیں۔

مولوی محمد ایوب خاں کیفی

مولوی محمد ایوب خاں نواب مجد الدین عرف نواب مجو مراد آبادی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے مراد آباد پر قبضہ کرلیا تو ان کے لئے بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

"ایوب خاں ولد انور خاں، فارسی شیخ احمد علی احمد سے پڑھی اور فن شعر میں بھی ان سے ہی اصلاح لی۔ اساتذہ کے اشعار بکثرت یاد ہیں۔ مجد الدین عرف مجو خاں مراد آبادی کے مختار تھے ۱۲۷۶ھ میں بجرم مختاری مقید ہوکر انڈمان بھیجے گئے۔ اور محبوس دائمی ہوکر اب تک (۱۲۹۶ھ) وہیں ہیں۔ ستر برس کی عمر ہے کلام ان کا زمانۂ غدر میں سارا تلف ہوگیا۔ دو شعر لے جو درج ہیں ؎

موباف سبز چوٹی میں رنگت بدل گیا
اندھیر ہے کہ سانپ زمرد نگل گیا
کیفی تپ فراق میں جینے سے یاس تھی
گھر سے پھرا خدا کے کرم سے سنبھل گیا"

مولوی محمد ایوب خاں کیفی جزیرہ پر سوبس اسٹیٹ میں محرر رہے۔ ۸ر فروری کو جب گورنر جنرل لارڈ میو جزیرہ انڈمان میں شیر علی آفریدی کے ہاتھوں مارا گیا تو کیفی

لہ انتخاب یادگار۔ منشی امیر مینائی، ص ۱۳۸

نے بیس اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کہا جس کے چند شعر یہ ہیں :ـــ

عمدہ لندن گورنر جنرل ہندوستاں
قیدیوں کی پرورش کو لائے تشریف انڈماں
پنج شنبہ فروری کی آٹھویں تاریخ تھی
روز محشر سے وہ شب پیدا ہوئی تھی تواماں
آفریدی شیر علی نے چھوری سے بسمل کیا
نیل کا ٹیکہ لگایا قیدیوں پر جاوداں [1]

جب جعفر تھانیسری نے کتاب تاریخ عجیب لکھی تو یہ تاریخ کہی :ـــ

انڈماں کا جو لکھا کل احوال
منشی جعفر نے بہ عنوان غریب
نام و تاریخ کی خواہش جو کی
کہا کیفی نے ہے "تاریخ عجیب" [2]
۱۲۹۶ھ

مولانا احمد اللہ صادق پوری (ف ۱۲۹۸ھ) کے انتقال پر کیفی نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا:

چوں ازیں دار فنا جانب باغ رضواں
احمد اللہ رواں گشت بہ صد دل شاداں
شش و ہفتاد سن عمر شریفش بودند
بحتاً گشت نصیبش سفر جاوداں
بست و ہشتم شبے بود از مہ ذی حجہ کہ او
راہی ملک بقا گشت ز دار گزراں

---

[1] - تاریخ عجیب، ص ۴۳-۴۲، مصنفہ محمد جعفر تھانیسری مرتبہ محمد ایوب قادری
[2] ایضاً ، ص ۲۲۸

اعتقادش بہ احادیث نبی از ہمہ بیش
اعتمادش ہمہ ہردم بہ نصوص قرآں
ہمہ زہد و ہمہ تقویٰ و ہمہ صوم و صلوٰۃ
ہمہ مصروف عبادت ہمہ صرف عرفاں
سال تاریخ وفاتش ز تفکر جستم
دخل الخلد بفرمود ہمہ دم رضواں
مہ قرباں بہ تمامی و محراب اقرب
سن تسعہ ز احادش بگر ہم بیگ آں سنہ
سنہ ۱۲۹۹ھ

لہ الدر المنثور فی تراجم صادق پور۔ از مولوی عبدالرحیم، ص ۱۵۰۔۵ (طبع اول سنہ ۱۹۰۱ء)
بحوالہ رسالہ اردو جنوری سنہ ۱۹۶۸ء، ص ۷۳

مفتی مظہر کریم دریابادی

مفتی مظہر کریم، مولانا عبدالماجد دریابادی کے دادا تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ مخدوم بخش تھا۔ یہ قدوائیانِ دریاباد میں سے تھے۔ مفتی صاحب نے اپنے بڑے بھائی نور کریم اور لکھنؤ کے دیگر علماء سے تعلیم حاصل کی۔ فراغ علم کے بعد انگریزی ملازمت اختیار کی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے موقعہ پر شاہجہاں پور میں سررشتہ دار عدالت تھے۔ تحریک آزادی میں جوش و خروش سے حصہ لیا اور کامیابی تحریک کے لیے بڑی محنت کی۔ گرفتار کر کے انڈمان بھیجے گئے۔ اور وہاں میجر جان ہاٹن کی فرمائش پر جغرافیہ کی مشہور کتاب مراصد الاطلاع کا ۱۸۸۱ء میں اردو ترجمہ کیا۔ اس کا خطی نسخہ حکیم عبدالقوی دریابادی کے پاس موجود ہے[1]۔ جو موصوف کے پڑپوتے ہیں۔ منیر شکوہ آبادی نے اس کی تاریخ کہی ہے۔

کمشنر صاحب والا مراتب حاکم نامی — کہ جن کا فیض سوئے منزلِ آرام رہبر ہے
ہوا منظور اون کو ترجمہ اس تحفہ نسخہ کا — زبان صاف اردو میں کہ جو آسان و بہتر ہے
مترجم مولوی مظہر کریم اس کے ہوئے دل سے — فضیلت جن کی روشن تر مثال مہر انور ہے
اسیری اور غربت میں پھنسے ہیں وہ بھی بند بھی — گھڑی بھر کا بھی کٹ جانا یہاں مانند خنجر ہے

منیر اس کی کہی تاریخ یوں سال مسیحی میں
یہی سیر جدید بوستان ہفت کشور ہے[2]
۱۸۶۷ء

---

[1] رسالہ اردو، جنوری ۱۹۶۸ء ص ۷۰۔ [2] کلیات منیر شکوہ آبادی ص ۴۹۹

سیّد احمد بریلوی

مفتی سید احمد بن کرامت علی شہدی سنبھل (مراد آباد) کے قدیم باشندے تھے بریلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد علم طب حاصل کیا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے۔ نواب خان بہادر خان ناظم روہیل کھنڈ کی حکومت میں مفتی کے عہدے پر سرفراز ہوئے[۱]۔ بریلی میں انگریزوں کے تسلط کے بعد دوبارہ حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مفتی صاحب نے جزائر کے آلام و مصائب سے گھبرا کر ایک منظوم عرض داشت بحضور سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم لکھی۔ ان کی رہائی کا حکم ہوگیا۔ لیکن وطن کی خاک انھیں نصیب نہ ہوئی اور انڈمان میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ؎

قسم ہے تجھے اے نسیم سحر — مری بے کسی پر ذرا رحم کر
میسر نہیں کوئی پیغام بر — مدینے میں ہووے جو تیرا گزر
تو میری طرف سے زمیں چوم کر — یہ کہنا بہ درگاہِ خیر البشرؐ
نبی الوریٰ یا نبی الوریٰ — بہ بیں حال من یا نبی الوریٰ
بندھے بند آہن سے سب دست و پا — رہا بند یک چند آب و غذا
نہ سنتا تھا جو کچھ وہ سب کچھ سنا — نہ ہوتا تھا جو کچھ وہ سب کچھ ہوا

---

[۱] ”بدایوں ۱۸۵۷ء میں“ از مولوی محمد سلیمان بدایونی ص ۹۷ (بحوالہ سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۶۸ء ص ۷۰، ۷۱)

لٹا گھر دیار وطن بھی چھٹا — چھٹے سب کے سب دوست اور آشنا
نبی انورینی یا نبی انوریٰ — برہیں حال سن یا نبی انوریٰ

جہاں پر عیاں حسن اخلاق ہے — ثنا گر ترا آپ خلاق ہے
ترے نام سے روشن آفاق ہے — تری ذات احساں میں طاق ہے

اسیری بہت اس پہ اب شاق ہے
یہ تیّد ربانیؔ کا مشتاق ہے

نواب قادر علی خاں

نواب قادر علی خاں بن بختور بہادر خاں (ف ۱۲۷۱ھ) شاہجہاں پور کے باشندے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ناظم شاہجہاں پور تھے۔ اس کے بعد ان کے خاندان کے ایک رکن نواب غلام قادر خاں نے نواب بہادر خاں بریلوی سے نظامت کی سند حاصل کی، اور مسند نشین ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء میں دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، نواب قادر علی خاں، عبدالرؤف خاں اور قاضی سرفراز علی شاہجہاں پوری دائم الحبس ہو کر انڈمان پہنچے۔ نواب قادر علی خاں ۲۷ سال کے بعد ۱۸۸۵ء میں وطن واپس آئے اور ۱۵ مارچ ۱۸۸۶ء کو انتقال فرمایا۔[۱]

نواب صاحب شعر و شاعری کا خاص ذوق رکھتے تھے جزیرہ انڈمان میں جب مسلمانوں نے ایک مسجد تعمیر کی تو اس کی تاریخ کہی۔[۲]

زنور بیت خدا انڈمان معرا بود
شنو کہ راست می گویم کدام موجد شد

بہ صوبہ دار بہادر ملقب و در نام
مسمی سبط خلیل خدائے واحد شد

بہ فکر سال چو رفتم زغیب قادر گفت
ہزار شکر کہ ایں جا بنائے مسجد شد
۱۲۹۴ھ

۱؎ تاریخ شاہجہاں پور از صبیح الدین خاں، ص ۱۳۲ - ۱۳۱

۲؎ تاریخ شاہجہاں پور از صبیح الدین میاں ص ۱۳۲ - ۱۳۱ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء

چمن خاں

چمن خاں کے حالات باوجود تلاش بسیار دستیاب نہ ہوسکے۔ وہ ذی علم اور موزوں طبع شخص تھے۔ انھوں نے نکوباری زبان اور اردو زبان پر مشتمل ایک مختصر نظم "خالق باری" لکھی۔ جو جعفر تھانیسری نے "تاریخ عجیب"[1] میں شامل کردی ہے۔ چار شعر نمونے کے طور پر درج ہیں :-

دیوسے کہیے نام خدا — چمن لیا نگ میں کیا نام ترا
توپ دینیا پیو شراب — ہتولاگ، ہتشی بڑا خراب
قان کیتو بھائی کی جورو — کپتو موبرا جنگلی گورو
یو چوش آن میں کہاں کو جاؤں — لوافان لیٹرہ جلدی آؤں

---

[1] تاریخ عجیب، محمد جعفر تھانیسری ص ۱۶۲-۱۶۱

منشی اکبر زماں

منشی اکبر زماں، اکبر آباد کے رہنے والے تھے، عربی و فارسی کی مروجہ تعلیم حاصل کی۔ مجید تخلص تھا۔ شروع میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ پھر قلعہ آگرہ میں منشی کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔

تحریک ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے، گرفتار ہو گئے، مقدمہ چلا، اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ جزائر انڈمان میں چیف کمشنر کے دفتر میں نائب میر منشی رہے۔ بیس سال کے بعد رہائی ہوئی۔ آگرہ میں ٹیوشن کر کے زندگی گذارنے لگے۔ آخر میں نابینا ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔[1]

منشی اکبر زماں کا کچھ کلام اور وہ خطوط جو انھوں نے شاہ مظفر علی کو لکھے تھے مولوی محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی کے پاس محفوظ ہیں۔

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء مفتی انتظام اللہ شہابی، ص ۲۰۷-

قاضی سرفراز علی

قاضی سرفراز علی ابن امانت علی، شاہ جہاں پور کے قدیم خاندان کے فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی پھر دہلی گئے۔ علمائے معروف کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء میں انقلابی حکومت کی طرف سے منصف مقرر ہوئے جس کے نتیجہ میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ جزائر انڈمان میں ایک انگریز کرنل نے ان سے فارسی پڑھی۔ کچھ مدت کے بعد رہائی ہوگئی۔ ۱۸۷۵ء میں شاہ جہاں پور میں عربی کے مدرس ہوئے۔ ۱۸۷۶ء میں انتقال ہوا۔

قاضی صاحب کو شعر و ادب کا ذوق تھا۔ زیادہ تر نعتیں کہتے تھے۔ سیّد تخلص تھا۔[1]

تاریخ جزائر انڈمان:۔

سٹھراداس سررشتہ دار حاکم پورٹ بلیر کی تحریک پر قاضی صاحب نے جزائر انڈمان کی ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی۔[2]

قاضی صاحب جب قید ہوکر انڈمان پہنچے تو وہاں انھوں نے ایک مناجات بھی لکھی تھی۔ جس کے چند شعر مولف تاریخ شاہ جہاں پور نے نقل کیے ہیں؎

مارا ز درماں دل و جانم فدائے تو ۔۔۔ اے مصطفیٰ تو شاہ من و من گدائے تو

---

[1] تاریخ شاہ جہاں پور، ص ۲۶۶-۲۶۸

[2] تاریخ شاہ جہاں پور، ص ۲۶۸

جید کہ شد اسیر بلا در ہوائے تو　　　　نازد بر آں اسیری کہ باشد برائے تو

پیش تو چیست عقدہ کشائی کہ ماہ را　　　　دو کرد یک اشارہ معجز نمائے تو

در دست تست دارُوے دردم درنگ چیست

اے منحصر رضائے خدا، بر رضائے تو

باب چہارم

ہندستان میں اسیر شاعر و ادیب

(حیات اور کارنامے)

بہادر شاہ ظفر

۲۸ رشعبان ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) کو منگل کے دن شاہ عالم کے دوسرے بیٹے مرزا اکبر شاہ کے محل میں سماۃ لال بائی کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ ابوظفر تاریخی نام رکھا گیا۔ یہی ابوظفر بعد میں بہادر شاہ ظفر کے نام سے مشہور ہوا۔ مرزا ابوظفر نے آنکھیں کھولیں تو شہزادوں کی طرح تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس عہد کے مشہور قاری محمد خلیل نے قرآن پڑھایا۔ فارسی انشا پردازی اور عربی دیاست کی تعلیم دی گئی۔ تیر اندازی، شہ سواری، تیغ زنی میں مہارت پائی، شعر و شاعری کا ذوق فطری تھا۔

۳۰ رستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۹ رجمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کے دن مرزا ابوظفر بہادر شاہ ثانی تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

تاریخ جلوس آں شہ والا قدر
آمد بہ لب خرد چراغ دہلی [۲]

عظمت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے سکّہ بھی موزوں کیا گیا:۔

بسیم و زرزدہ شد سکہ بر فضل الٰہ
سراج دیں ابوظفر بہادر شاہ [۳]

---

[۱] بہادر شاہ ظفر منشی امیر احمد علوی، ص ۱۷

[۲]، [۳] بہادر شاہ ظفر۔ منشی امیر احمد علوی، ص ۲۰-۱۷

بہادر شاہ ظفر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے کو تو ہو گئے، لیکن ان کی حکومت لال قلعہ تک محدود تھی ان کی حیثیت شطرنج کے مہرے سے زیادہ نہ تھی۔ ہندوستان انگریزوں کی ملکیت میں آچکا تھا۔ چاروں طرف انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ تباہی، غارت گری، لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ انگریزوں نے طے کر لیا تھا کہ مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھا دیں۔ ملک کی فضا حد درجہ تشویش ناک تھی۔ اسی انتشار اور پریشانی کے عالم میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ حادثہ ۱۸۵۷ء کے حالات پہلے بیان کیے جا چکے ہیں لیکن تحریک آزادی کا ظفر پر کیا اثر پڑا اس کا مختصراً ذکر ضروری ہے۔ جس سلطنت کی وسعتیں کسی زمانہ میں کابل و قندھار سے برما اور راس کماری کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھیں وہ سمٹ کر لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود ہو گئی۔ تاہم اس کا نام باقی تھا اور ہندوستان کے فرماں روا کی مہر کے بغیر کسی کی فرماں روائی کا سکہ نہیں چل سکتا تھا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں شروع ہوا بہادر شاہ ظفر ارادہ نہ رکھنے کے باوجود اس میں شریک ہوئے۔ مئی ۱۸۵۷ء کا مہینہ آیا اور ہنگامہ بنگالے کی انگریز سپاہ کا برپا ہوا اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے سارا ملک بہادر شاہ کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن ان ہمدردوں میں سچے ہمدرد بھی تھے، بد خواہ بھی، سازشی بھی، مخبر بھی اور انگریزوں کے ایجنٹ بھی۔ بہادر شاہ کے حامیوں میں اکثر نے ساتھ نہ دیا اور انھیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

> "جب ۱۹ ستمبر کی رات کو انگریزوں کا قبضہ شہر کے بڑے حصّہ پر ہو گیا، شکست کے بعد باغیوں کا سپہ سالار بخت خاں نے بادشاہ کو سمجھایا کہ انگریزوں نے حضور سے دلّی لے لی تو کیا ابھی تو سارا ملک حضور کے ہاتھ میں ہے۔ اگر حضور ہمارے ہمراہ چلیں تو حضور کے نام اور ذات کی برکت سے ظن غالب ہے کہ ہم کو لڑائیوں میں فتوح حاصل ہو سکتی ہیں۔ بادشاہ نے بخت خاں کو رخصت

کیا اور کہا کہ ہمایوں کے مقبرے میں کل ملنا"۔ [۵]

لیکن مرزا الٰہی بخش نے جو انگریزوں سے ملا ہوا تھا، بادشاہ کو سمجھایا کہ وہ ہمایوں کے مقبرے میں نہ جائیں۔ مرزا کے دلائل نے ظفر کو راضی کرلیا۔ دوسرے دن بادشاہ اور اس کے بیٹے، اس کے امراء بخت خاں سے ملے اور ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

الٰہی بخش کے ذریعہ انگریزوں نے سازش کی اور بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرے میں رہنے پر مجبور کیا گیا اور جنرل بخت خاں ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ چار شہزادے تھے مرزا مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان، مرزا ندو۔ قلعہ سے رخصت ہونے کے بعد انگریز محافظ دستہ نے انھیں گھیر لیا۔ بادشاہ کو پالکی میں بٹھایا گیا اور شہزادوں کو بیل گاڑی پر۔ اور وہاں سے قلعہ لیجایا گیا جب شہزادے دیوان عام کے سامنے پہنچے تو انھیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا بادشاہ پر پہرا بٹھا دیا گیا اور حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا گیا نواب زینت محل اور مرزا جواں بخت کو ایک قریب کے الگ مکان میں قید کر دیا۔

۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ فوجی کمیشن کے روبرو لائے گئے، بادشاہ پر جتنے الزامات تھے، صحیح ثابت کیے گئے اور انھیں جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

۷ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے تقریباً سال بھر بعد انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو بال بچوں سمیت کلکتہ بھیج دیا۔ راشد الخیری، بہادر شاہ ظفر کی روانگی کا دردناک منظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب وہ ساعت آئی کہ بدنصیب بادشاہ جنگی پہرے میں دلی سے وداع ہوا تو خلقت منھ اندھیرے سڑکوں پر آ بیٹھی یہ وہ صبح تھی جس میں ماؤں نے اپنے معصوم بچوں پر کھانا پینا حرام کر دیا اور

۵۔ تاریخ عہد انگلشیہ۔ منشی ذکاء اللہ، ص ۶۹۵

جب تک اپنے بادشاہ کو آنسوؤں کے حلقہ میں خدا کے سپرد نہ کر لیا
چولھوں میں آگ نہ جلائی ۔" [1]

۱۸۵۸ء کے آخر میں بہادر شاہ ظفر رنگون پہنچے جہاز سے اترتے ہی گورنمنٹ کی حفاظت میں (حراست میں) بندرگاہ سے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلہ میں لے جائے گئے، چھ سو روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی تھی، فاقہ کشی اور غربت کی زندگی تھی، پھر بھی حمیت و غیرت ترک نہ کی، زینت محل ساتھ تھیں ان کے زیورات ذریعہ معاش بنے اور بد نصیب زندگی کی آخری سانسیں افلاس میں گزریں۔ شاعری کا شوق رنگون میں برقرار رہا، کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل غزل رنگون کی بے کسی و بے بسی کی یادگار ہے :

کون نگر میں آئے ہیں ہم کون نگر میں باسے ہیں [2]
جائیں گے اب کون نگر کو من میں لیسے بسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا
کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہیں
کیا کیا پہلو دیکھے ہیں ہم نے اس پھلواری میں
اب جو کھلے پھول یہاں کچھ اور ہی اس میں باسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسیرا بیت گئی رہی تھوڑی سی
ان سے کہدو سو نہ جاویں نیندیں جو کہ نیند آسے ہیں

حسب ذیل اشعار بھی اسیری کی یادگار کہے جاتے ہیں :

یار نہیں غمخوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
کنج غم میں آپ ہی کہئے دل کو میرے بہلائے کون

---

[1] نوبت پنج روزہ ۔ راشد الخیری، ص ۱۵۶
[2] نوائے ظفر مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۲۲۲

تقدیر میری ان دنوں کیسی بگڑ گئی
ہاتھوں میں وہ پری میرے آکر نکل گئی

اے وائے انقلاب زمانہ کے جور سے
دہلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے رونے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے اس انجمن سے چلے

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہیو اس سے کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشق زار تھا تہِ خاک اس کو دبا دیا
پس مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی پڑھے کہاں
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں میرا سینہ غم سے فگار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا اک چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے

نہ دبایا زیرِ چمن انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں، کہیں نشان کا مزار ہے

کیا ہے غم ظفرؔ تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے

بہادر شاہ ظفرؔ پانچ برس رنگون میں قید رہے، وہاں ان پر جو کچھ بیتی اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھیں لکھنے پڑھنے کی اجازت نہ تھی کاغذ قلم کا مہیا ہونا ناممکن تھا، ایسے حالات میں انھوں نے وہاں کیا کچھ کہا، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے، آخر وقت ان کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی، اور وہ مکان کی دیواروں پر کوئلہ وغیرہ سے اشعار لکھا کرتے تھے، اس میں صداقت کس حد تک ہے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آخر کار موت کا وقت آ پہونچا، بادشاہوں کے محل میں پروان چڑھنے والا غربت کدہ رنگون میں زندگی اور موت کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ موت کے وقت زینت محل جواں بخت، ان کی بیوی اور ایک چھوٹی بچی کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ سنہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء میں ظفرؔ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[1] حکام کی اجازت سے اسی مکان میں دفن کر دیئے گئے۔ جس میں قید تھے۔ زینت محل نے وہیں سنہ ۱۸۸۶ء میں انتقال کیا اور مرحوم کی قبر کے نزدیک دفن ہوئیں۔

ظفرؔ نے زمانہ ولی عہدی میں ایک کتاب لغت اور اصلاح سخن کی تین جلدوں میں لکھ کر سنہ ۱۲۲۶ھ میں تمام کی تھی۔ اس کا نام تالیفات ابوظفری تھا۔ اس کتاب کا پتہ نہیں

---

[1] قبر پر اردو زبان میں کتبہ ہے جس کے آخر میں یہ قطعہ تاریخ ہے:-

چودہ جمادی الاولیٰ جمعہ کا روز، وقت عصر ۔۔۔ حالت قید و بے کسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
تھا ۔۔۔ سے عرش کیا وطن سے دور ۔۔۔ خلد ہے آپ کا وطن اے "ظفرِ جلاوطن"
۱۲۷۹ھ

چلتا۔ ظفر نے شرح گلستاں کے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شرح گلستاں ۱۲۵۹ھ میں شائع ہوئی اور تصوف سے متعلق ہے۔ تاریخی نام خیابان تصوف ہے۔

ظفر کا پہلا دیوان زمانہ ولی عہدی کا یادگار ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ۱۲۲۳ھ۔ ۱۲۲۴ھ میں مرتب ہوا لیکن حالات کی نامساعدت کی بدولت عرصہ تک شائع نہ ہو سکا ۱۲۶۱ھ میں پہلی بار طبع ہوا۔

دوسرا دیوان ۱۲۶۶ھ میں اور دیوان سوم و چہارم انقلاب ۱۸۵۷ء سے کچھ دن پہلے طبع ہوئے۔

بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ ظفر کا پانچواں دیوان ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ظفر کا بہت سا کلام ایام غدر میں حکیم احسن اللہ خاں نے تلف کر دیا۔

محمد حسین آزاد نے محض اپنے استاد ذوق کی عظمت کا جھنڈا گاڑنے کے لئے ظفر کے کلام کو ذوق کا نتیجہ فکر قرار دیا ہے، اور ظفر کی شاعری پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد کی اس کوشش کا عام ذہنوں پر جو بھی اثر پڑا ہو اہل علم نے اسے آزاد کی زیادتی قرار دیا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

> "یہ جو مشہور ہے کہ استاد ذوق اشعار کہہ دیا کرتے تھے اور بہادر شاہ اپنے نام سے محفل میں سنا دیا کرتے تھے، محض غلط ہے، لغو ہے جس کو کچھ بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کا مذاق ہو گا وہ سمجھ سکتا ہے کہ ذوق اور ظفر کے رنگ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"[1]

مولوی عبدالحق نے 'چند ہم عصر' میں اس موضوع پر سرسید کی رائے لکھی ہے

> "ایک بار ذوق اور ظفر پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پرانی بحث دہرائی گئی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں۔ سید صاحب

---

[1] چراغ دہلی، ص ۵۰

اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آ گئی ہے[1]۔"

نیاز فتح پوری کی رائے ہے:

"ذوق میں ایک چیز اور تھی جسے جوش و خروش کہتے ہیں اور جس کا پورا اظہار ان کے قصائد میں ہوا ہے، ظفر کے کلام میں اس چیز کا پتہ نہیں اور نہ ان کا یہ فطری رنگ تھا اور اسی کو دیکھ کر آزاد کا یہ الزام کہ ظفر کا کلام ذوق کی فکر کا نتیجہ ہے بالکل اٹھ جاتا ہے[2]۔"

خلیل الرحمن اعظمی نے ذرا تفصیل سے ذوق اور ظفر کی شاعری کا جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آزاد نے جس قسم کے کلام کو ذوق سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے خود اس کی نوعیت کیا ہے؟ اگر وہ کلام کسی شاعر کے کلیات میں موجود ہو تو کیا اس کے لئے سرمایہ افتخار بن سکتا ہے؟ آزاد نے بار بار اس کا تذکرہ کیا ہے کہ بادشاہ ردیف، قافیہ خوب سوچتا تھا۔ اور نئی نئی انوکھی زمینوں کا بادشاہ تھا۔ انھیں زمینوں کو سرسبز کرنے کا کام ذوق کے سپرد تھا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر میں ان غزلوں کی بڑی وقعت تھی اور ان کے شعری نقطہ نظر سے اس نوع کی شاعری کمال فن کی دلیل تھی۔ دوسرے یہ کہ آزاد نے مثال کے طور پر جو شعر آب حیات میں دیے ہیں اور انھیں ذوق سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے ان کی شعریت اور ادبی قدر و قیمت پر بھی غور کرنا ہے میری رائے یہ ہے کہ جس شخص کو ذرا سا بھی شعر کا مذاق ہے اور اسے

---

[1] چند ہم عصر، ص ۲۲ [2] انتقادیات، ص ۵۰

ادنیٰ درجہ کی موزوں گوئی کی اور لفظی بازی گری کے مقابل حقیقی شاعری
اور تخلیقی عناصر کی پرکھ کا سلیقہ ہے وہ اگر ظفر کے کلیات کو پڑھنے کی
ہمت کرے اور اس نوع کی غزلیں اس کی نظر سے گزریں اسے ظفر سے
ایک طرح کی نفرت ہو جائے گی اور یہی فیصلہ دینا ہوگا کہ اس طرح کے
کلام سے سچی شاعری سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس طرح کی
سپاٹ نظم نگاری اور شعر بازی تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں[۱]"

اس کے برعکس اعظمی صاحب کی رائے میں "کلیات ظفر سے خس و خاشاک کا یہ انبار علیحدہ کر دیا جائے تو ڈھائی تین سو غزلوں کا ایک خوبصورت سا دیوان نکل آتا ہے اور ایک ایسا مجموعہ جس پر ظفر کی چھاپ لگی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں ظفر کی آواز اس کا لب و لہجہ، شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان سے نہ صرف الگ ہوتا ہے بلکہ تغزل شاعرانہ کیفیات اور جمالیاتی رچاؤ کے اعتبار سے یہ کلام اردو غزل کے اس سرمایہ سے قریب آجاتا ہے جس کی آبیاری میر، قائم، یقین، درد، مصحفی، سوز اور آتش جیسے شعرائے کی اور جن کے کلام کا منتخب حصہ اپنے اندر ایسی تازگی و دلکشی و تاثیر رکھتا ہے جس کی اپنی دائمی اقدار ہیں اس حصہ میں بھی غالب حصہ اس کلام کا ہے جو ظفر کی آپ بیتی ہے اور اس میں کچھ نشتریت اور گداز ہے کہ جو اردو غزل کے سرمایہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ظفر یہاں ایک ایسے شخص کے روپ میں نظر آتا ہے جس کی زندگی کا ایک ایک سانس اپنے غموں کی زنجیر سے الجھا ہوا ہے[۲]"

کہنے کو تو بہادر شاہ نے زندگی کے آخری ایام رنگون میں گزارے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی ایک طرح کی روحانی کشمکش اور ذہنی جلاوطنی میں گزری ایک مسلسل کچوکے دینے والا عذاب اور ہڈیوں کو پگھلا دینے والا غم ان کی شاعری کا اصل محرک ہے اور اس آگ میں جل کر انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ ہمارے سامنے ایک

---

[۱] نوائے ظفر، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ص ۲۳، ۲۴ [۲] نوائے ظفر، ص ۲۴

زبردست المیہ کردار پیش کرتے ہیں۔ بہ قول خلیل الرحمٰن اعظمی

"ظفر کی شاعری کا ایک اور بنیادی عنصر زنداں کی وہ دیوار ہے جس سے ٹکرانے میں اس کے جسم و جان خستہ و خونگار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زنجیر میں جکڑ کر اس کے ہونٹوں کو سی دیا گیا ہے اور زنجیر کے جھٹکے اور جھنکار اس کے درد و کرب کا اظہار ہیں اس جھنکار میں اسیری کا بے پناہ غم بھی ہے اور رہائی کے لیے جدوجہد کا حوصلہ بھی۔ اردو کے کسی غزل گو نے زنداں اور زنجیر کو اس تسلسل کے ساتھ بطور علامت کے استعمال نہیں کیا ہے[1]۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"زنداں اور زنجیر سے بھی زیادہ اہم علامت ظفر کی شاعری میں قفس و آشیاں اور صیاد و عندلیب کی ہے اردو غزل کا یہ استعارہ عام طور پر بہت پامال ہے اور بیشتر شعراء نے اسے رسمی اور روایتی طور پر استعمال کیا ہے لیکن ظفر کے یہاں یہ علامت ایک تخلیقی قوت بن جاتی اور اس کا جتنا موثر اور جاندار استعمال ظفر کے کلام میں ملتا ہے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔ ان اشعار میں ظفر نے ایک طرف اپنی مجبوری، بے بسی، بے پروائی اور درماندگی اور موت و حیات کی کشمکش کی مصوری کی ہے جس سے ان کی زندگی عبارت تھی دوسری طرف ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے نام لیواؤں کی اپنے ناموس کے تحفظ کیلئے آخری جدوجہد اور باغیانہ عزم کا مکمل اظہار بھی۔ ۱۸۵۷ء انقلاب کی ناکامی کی تاریخ جب بھی مرتب کی جائے گی اس کے لئے سب سے معتبر اور خام مواد ظفر کے کلام سے مل سکے گا[2]۔"

---

[1] نوائے ظفر، ص ۲۶

مرزا غالب دہلوی

مرزا غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے مغل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ پانچ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چچا نے پرورش کی بدقسمتی سے وہ بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور ان کے وارثوں کی پنشن کا کچھ حصہ مرزا کو بھی ملنے لگا۔ مرزا کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں ابتدائی تعلیم مرزا نے انھیں سے حاصل کی۔ آگرہ میں مولوی محمد معظم سے فلسفہ و منطق، طب، نجوم، صرف و نحو و دیگر مروجہ علوم سے واقفیت حاصل کی۔ ۱۳ برس کی عمر میں مرزا کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہو گئی۔ شادی کے بعد مرزا کو روزی کی فکر ہوئی۔ اسی زمانہ میں سرکاری پنشن بھی بند ہو گئی۔ مرزا نے پنشن کے اجرا کے لئے کلکتہ کا سفر بھی کیا لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ ۱۸۴۲ء میں مرزا کو ٹامسن کالج میں پروفیسری کی پیش کش کی گئی مرزا کی خودداری نے قبول نہیں کی۔ ۱۸۴۷ء میں ان کی زندگی کا ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا، یعنی قمار بازی کے جرم میں گرفتار ہوئے مقدمہ چلا اور چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ احباب کی جد و جہد سے تین ماہ بعد رہا ہو گئے۔ قید سے رہائی کے بعد مرزا کی رسائی قلعۂ معلیٰ میں ہو گئی۔ حکیم احسن اللہ خاں کی کوششوں سے بادشاہ نے مرزا غالب کو شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا اور ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کی طرف سے "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" کا خطاب ملا، اور خلعت عطا ہوئی۔ ۶۰۰ روپے سالانہ تنخواہ تاریخ نویسی کے لئے مقرر ہوئی۔ ۱۸۵۰ء کے دوران ولی عہد بہادر

شہزادہ فتح الملک نے شاعری میں مرزا کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپے سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ مرزا کی اردو شاعری کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا۔ اس سے پہلے فارسی میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ ۸ رمارچ ۱۸۵۲ء میں تاریخ شاہان تیموریہ کا پہلا جزو ''مہر نیم روز'' کے نام سے مکمل کیا۔

ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنا استاد بنالیا۔ ۱۸۵۷ء میں فضل حق کے ذریعہ مرزا کا تعلق رام پور سے بھی ہو گیا۔ اور نواب یوسف علی خاں کے استاد مقرر ہوئے۔ انھوں نے تاحیات سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں مرزا دہلی میں موجود تھے اپنی کتاب دستنبو میں اس دور کے مفصل حالات انھوں نے تحریر کیے ہیں۔

عمر کے آخری سال نہایت بے چینی سے گزارے۔ مختلف بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ دس ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء) کو مرزا نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور درگاہ نظام الدینؒ میں دفن ہوئے۔

حادثہ اسیری:۔

۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں غالب پر اسیری کی مصیبت آئی۔ حالی نے لکھا ہے کہ غالب نے ایک فارسی خط میں اس واقعہ کا مختصراً حال لکھا ہے۔ یہ خط کلیات نثر میں موجود نہیں۔ غالباً غیر مطبوعہ ہے۔ حالی نے اس کا جو اقتباس دیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اور جب کھیلتے تھے تو برائے نام بازی بد کر کھیلتے تھے۔ کوتوال دشمن تھا۔ اس نے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ مجسٹریٹ غالب کی حیثیت مرتبہ اور ذاتی حالات سے ناواقف تھا۔ اس نے ۶ ماہ کی سزا دیدی۔ سیشن جج میں اپیل کی گئی۔ جج اگرچہ غالب کا دوست تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملتا تھا لیکن اس نے بھی تغافل اختیار کیا اور سزائے قید بحال رکھی۔ صدر میں اپیل کی گئی۔ لیکن وہاں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ تین مہینے گزر جانے کے بعد مجسٹریٹ نے خود ہی رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اور غالب رہا ہو گئے۔

قید میں ان کی حالت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا کپڑا اور ضرورت کی دوسری چیزیں ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست بے تکلف ملتے تھے لیکن اس زمانے کے حالات اور نوعیت جرم کے اعتبار سے یہ واقعہ سخت ذلت خیز تھا۔ اور غالب نے اسے بے حد محسوس کیا۔ حالی کے بیان کے مطابق انھوں نے فرمایا:

"اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا عین عبودیت کے خلاف نہیں ہے میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں[1]"

منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں، جس پر ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کی تاریخ درج ہے، کہ:

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔[2]"

مولانا آزاد نے حالی کی تعبیر کو جانب داری سے تعبیر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ:

"واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیر الدین مرحوم (لاھورو) کے لفظوں میں مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔[3]"

---

[1] یادگار غالب۔ حالی، ص ۲۷-۲۸۔ [2] یادگار غالب ص ۲۸۔
[3] نقش آزاد، ص ۲۸۲

حکام بھی ان حرکتوں سے چشم پوشی کرتے تھے فی الواقع یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی کیوں کہ اس زمانے میں خوش باش امیروں کا یہ عام شغلہ تھا لیکن جوں ہی سنجیدہ مزاج حاکم آجاتا ہنسی کھیل کی تفریح بلائے جان بن جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۱ء میں[1] اسی طبیعت کے ایک تھانہ دار صاحب اس علاقہ میں تعینات ہوگئے۔ انھوں نے ایک دن مرزا کے مکان پر چھاپہ مارا اور انھیں دوستوں سمیت کھیلتے میں گرفتار کرلیا۔ پیشی پر عدالت نے سب پر جرمانہ کردیا مزید یہ حکم ہوا کہ جرمانہ ادا نہ کرنے پر ۴ ماہ کی قید بھگتیں مرزا نے جرمانہ دے کر جان چھڑائی۔

۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو مرزا غالب جوئے کے الزام میں دوبارہ گرفتار کر لئے گئے اور اب کے بار اس کا نتیجہ افسوس ناک نکلا۔ مالک رام لکھتے ہیں:

"مئی ۱۸۴۷ء کی تصدیق طبقات الشعرا ہند (ص ۴۰۷) سے بھی ہوتی ہے لیکن تاریخ کا تعین فوائد الناظرین سے ہوا"[2]

اوپر کے حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کا مکان قمار بازی کا اڈا بن گیا تھا لوگ مرزا کے مکان پر جمع ہوتے اور جوا کھیلتے تھے۔ جب تک مرزا خانی کوتوال شہر تھا کوئی خوف نہ تھا۔ وہ غالب کا مداح تھا۔ فیض الحسن خاں نئے کوتوال تعینات ہوئے یہ غالب سے ناواقف تھے۔ اور طبیعتہً سخت تھے۔ انھیں مرزا سے عداوت سی ہوگئی۔ ادھر حکام بھی جوئے کی وبا کم کرنے کی سعی کر رہے تھے بس ایک دن کوتوال مرزا کے مکان پر پہنچے اور اطلاع کرائی کہ کچھ زنانی سواریاں آئی ہیں جس پر کسی نے ان کے داخلہ پر اعتراض نہیں کیا۔ لیکن جب اندر جانے پر بھید کھلا تو کچھ مزاحمت ہوئی جس پر پولیس کو سختی کرنا پڑی اور نوبت زد و کوب تک پہنچی۔ بہر حال مرزا گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ

---

[1] ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء ص ۴، ک ۲۔ (غالب اور دہلی اردو اخبار) ہندستانی اخبار نویسی۔ از محمد عتیق ص ۲۷۳۔ [2] فوائد الناظرین (دہلی)، ۳ مئی ۱۸۴۷ء بحوالہ مکاتیب غالب ص ۷۰۔
[3] ذکر غالب۔ مالک رام ص ۱۰۸ جدید اڈیشن۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

کنور وزیر علی خاں مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ خود بہادر شاہ ظفر نے سفارش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ۶ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا کا حکم دیا گیا اور جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں ۶ ماہ مزید قید اور اصلی جرمانہ کے علاوہ پچاس روپے ادا کریں تو مشقت معاف ہو جائے گی[1] لیکن مرزا پورے چھ ماہ قید میں نہیں رہے تین ماہ بعد ڈاکٹر راس سول سرجن دہلی کی سفارش پر رہا کر دیئے گئے۔

غالبؔ کا حبسیہ!

اسیری کی حالت میں مرزا غالب نے ۴۸ اشعار کا ایک فارسی ترکیب بند لکھ ڈالا جو ان کی بہترین نظموں میں ہے مالک رام لکھتے ہیں:

"قید خانہ میں جو ترکیب بند انھوں نے لکھا ہے، جسے ہم موضوع کی مناسبت سے اسیریہ کہہ سکتے ہیں، وہ فارسی نظم کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اسلوب بیان اور سوز و گداز اور شدت جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ خاقانی کے حبسیہ سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو یقیناً اس سے بڑھ گیا ہے۔"[2]

غالبؔ کے عزیزوں اور دوستوں نے اسے کلیاتِ نظم میں شامل نہیں ہونے دیا۔ کلیاتِ نظم کی اشاعت کے بعد غالبؔ نے سبد چین میں اسے شامل کر لیا تھا۔ یہ ان کے متفرق کلام کا مجموعہ تھا۔ سبد چین کا کلام بعد کے ایڈیشنوں میں شامل نہیں کیا گیا۔

قید کی حالت:-

قید میں غالبؔ کی حالت حالی کے بقول محض نظر بند کی تھی، کھانا کپڑا اور دوسری ضروری چیزیں گھر سے آتی تھیں۔ دوست احباب بے روک ٹوک ملتے تھے۔ عام قرائن بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن خود غالبؔ نے اپنے حبسیہ میں لکھا ہے:

شادم از قید کہ بند معاش آزادم
از کف شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

---

[1] دہلی کی آخری سانس۔ خواجہ حسن نظامی، ص ۴۱۔ [2] ذکر غالبؔ، مالک رام، (جدید ایڈیشن)، ص ۱۰۹۔

غلام رسول مہر کے خیال میں یہ محض سخن گستری ہے یا ممکن ہے کہ ابتدائی ایام کی کیفیت ہو یا پچاس روپے ادا کرنے پر مختلف ہو لیتیں بہم پہنچا دی گئی ہوں[1]۔

غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے سلسلہ میں مختلف اصحاب نے یہ شعر بھی لکھا ہے:

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتار بلا ہیں
کپڑے میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جناب نظامی بدایونی فرماتے ہیں کہ

"غالب اتفاقاً قید ہو گئے تھے وہاں کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں ان کو چن رہے تھے کہ ایک رئیس نے جا کر پرسش کی۔ غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا[2]"

جناب غلام رسول مہر کی رائے میں "یہ شعر غالب کا نہیں، قطع نظر شعر کی شان نزول قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اگرچہ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق قید میں ان کی حالت محض نظربند کی تھی یا ۵۰ روپے ادا کر کے مشقت معاف کرالی گئی تھی تو بے یاری و درماندگی کی یہ حالت کیوں کر قرین قیاس بھی جا سکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں[3]"۔

جیسے غالب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ابتلا میں شیفتہ نے دوست نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اسی وجہ سے غالب نے نواب صاحب کا ذکر خاص طور سے کیا بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ ایسا غم خوار دوست عزاداری کے لئے موجود ہو تو مرنے کا غم نہیں۔ نیز عید الفطر قید میں گزری تھی، اگرچہ چھ ماہ کی مدت جیل میں پوری ہوتی تو عید الاضحیٰ بھی قید میں آجاتی[4]۔

---

[1] غالب ۔ غلام رسول مہر ص ۱۰۷، طبع لاہور

[2] دیوان غالب، شرح نظامی طبع ششم ص ۲۱۸

[3] غالب ۔ غلام رسول مہر ص ۱۰۸

[4] ۱۲۶۳ھ کی عید الفطر ۳ راگست ۱۸۴۷ء کو ہوئی تھی اور ۸ ر نومبر ۱۸۴۷ء کو عید الاضحیٰ۔

دہلی کا آخری سانس[1]، (جو احسن الاخبار کے فارسی مضامین کا ترجمہ ہے) کے ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کے حالات میں مرزا کی گرفتاری کی خبر موجود ہے۔ اور سارے حالات درج کر دیے ہیں۔ اسے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب کی صحت اس زمانہ میں اچھی نہیں تھی، وہ پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ ان کی سزا کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ ان کے مرتبہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ غالب باکمال رئیس سمجھے جاتے تھے ان کی عزت و احترام کا سکہ چل رہا تھا اور ان کی کمزوری کی وجہ سے عام خیال یہ تھا کہ وہ اسیری کی تاب نہ لاسکیں گے انھیں اتنی سخت سزا نہ دی جانی چاہیے۔

عہد اسیری میں غالب نے صرف یہی ایک حبسیہ لکھا جو ترکیب بند کی صورت میں ۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور فارسی زبان میں ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنہائی اور اسیری کی اذیت سے زیادہ انھیں رسوائی اور ذلت کے احساس سے ان کا دل خون ہو گیا تھا۔ تاہم اس حبسیہ سے بے ساختگی کے باوجود جو تخیلی بلند پردازی اور فنی پختگی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اعصابی تشنج پر قابو پانے کی قدرت رکھتے تھے۔ اس نظم میں بھی درد و غم کی ایک تہہ نشین موج کے باوجود ان کی وسیع المشربی، شوخیٔ فکر اور شگفتگیٔ بیان کے نقوش ملتے ہیں۔ چوں کہ یہ نظم فارسی میں ہے اور فارسی کا کلام ہمارے مطالعہ کا موضوع نہیں اس لیے نظم کا پہلا بند پیش کیا جاتا ہے:

خواہم از بند بزنداں سخن آغاز کنم — غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
بنوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب — خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی برجہاں سیکدہ بنیاد نہم — در اسیری بہ سخن دعویٔ اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید لبشتر آویزم — روز کے چند رسن تابی آواز کنم
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم — چوں نویسم غزل اندیشہ زغماز کنم

---

[1] دہلی کا آخری سانس خواجہ حسن نظامی ص ۱۷۱، ۱۷۴، ۱۷۵۔

تا چہ افسوں بخود از ہیبت صیاد دہم
تا چہ خوں در جگر حسرت پرواز کنم

یار دیرینہ قدم رنجہ نفرما کہ اینجا
آں نہ گنجد کہ تو در کوبی و من باز کنم

ہائے ناسازی طالع کہ بہ بن گردد باز
با خرد شکوہ گر از طالع ناساز کنم

اہل زنداں بہ سر چشم خودم جا دادند
تا دریں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

بلہ درماں گرفتار و فا نیست بہ شہر
خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنم

من گرفتارم و ایں دایرہ دوزخ تن من
در سخن پیروی شیوۂ ایجاز کنم

گرچہ توقیع گرفتاری جاویدم ہست
لیکن از دہر دگر خوش دلی امیدم نیست[1]

---

[1] ماخوذ از سید حسین مکتبہ جامعہ ۱۹۲۸ء ص ۲۴، ۲۵

واجد علی شاہ

آخری تاج دار اودھ سلطان عالم نواب واجد علی شاہ ابن امجد علی شاہ ۱۹ر جولائی سنہ ۱۸۲۳ء[1] یوم سہ شنبہ کو پہر دن چڑھے پیدا ہوئے اور سہ شنبہ ۱۳ر فروری سنہ ۱۸۴۷ء کو تخت نشیں ہوئے[2]۔ ۷ر فروری سنہ ۱۸۵۶ء[3] کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے اور ہندستان کے گورنر جنرل ڈلہوزی نے اودھ کو ضبط کرلیا۔ واجد علی کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اور ۱۵ لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ انھوں نے انگریزوں کے اس فیصلہ کو قبول تو کرلیا لیکن مشیروں کی صلاح سے لندن جاکر دادخواہی پر تیار ہوئے۔ ۱۳ر مارچ سنہ ۱۸۵۶ء[4] کو اپنے پھوپھا نواب حسام الدولہ کو مختار بناکر راہی کان پور ہوئے ۱۶ر اپریل کو بنارس پہنچے، راستہ میں ایک ہفتہ الہ آباد رکے، لکھنؤ سے بنارس بگھی میں اور وہاں سے دخانی جہاز پر سوار ہوکر ۱۲ر مئی سنہ ۱۸۵۶ء کو کلکتہ پہنچے[5]۔ ایک سال بعد سنہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب برپا ہوگیا اور واجد علی شاہ

---

[1] و [2] تاریخ اودھ جلد V محمد نجم الغنی خاں ص ۱۲۰؛ ۱۲۱ [3] ایضاً ص ۲۶۵، واجد علی شاہ کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۲۷ر کو پیش آیا فرماتے ہیں:

ولابست و ہفتم تھی اس ماہ کی
چھٹی سلطنت جس میں مجھ شاہ کی
اکتھر تھے سن بارہ سو پر زیادہ
تو میری زباں سے رکھ اب اس کو یاد

خزن اختر، ص ۴۸

[4] تاریخ اودھ جلد V ص ۲۶۱۔ [5] تاریخ اودھ ج V ص ۲۷۳

مٹیا برج سے فورٹ ولیم میں ۵ ماہ شوال ۱۲۷۳ھ (مئی ۱۸۵۷ء) میں بحیثیت قیدی بھیج دیئے گئے۔ وہاں انھیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا انھیں اپنی مثنوی حزن اختر میں بیان کیا ہے۔ ان کے ساتھ ۲۳ مرد وزن کلکتہ گئے تھے ان میں چھ بیگمات بھی تھیں۔ وہ فرماتے ہیں:

کروں ساٹھ ستر محل گر شمار — تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار

اب ان میں ہیں یہ پانچ چھ بیویاں — جو کلکتہ میں ساتھ آئیں یہاں [۱]

ان ساٹھ ستر محلات میں ایک بیگم ممتاز جہاں اکلیل محل تھیں جن کا خطاب زیب محل تھا، لکھنؤ میں رہ گئی تھیں۔ اسیری کے ایام میں واجد علی شاہ نے ان کے نام متعدد خطوط کلکتہ سے لکھے۔ "یہ خطوط ایک مخطوطے کی شکل میں برطانوی عجائب خانہ میں موجود ہیں اور اس کا کوئی اور نسخہ نہیں ملتا۔" [۲]

کلکتہ فورٹ ولیم سے ہی اسیری کے دوران واجد علی شاہ نے ملکہ غزالہ کے نام بھی خطوط لکھے۔ ان خطوط کا مجموعہ "تاریخ غزالہ" [۳] کے نام سے شائع ہوا جسے سید وصی بلگرامی نے مرتب کیا ہے۔ تاریخ غزالہ کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نسخہ میں مکاتیب کو چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ پہلی فصل رجب المرجب کے ایک خط پر مبنی ہے اور آخری فصل ذوالحجہ کے مکاتیب پر۔ اس مجموعہ کا پہلا خط ۲۸ رجب ۱۲۷۵ھ میں لکھا گیا اور آخری خط ۱۷ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو۔ یہ زمانہ واجد علی شاہ کی اسیری کا زمانہ تھا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خطوط بھی اسیری کے قیام کی یادگار ہیں۔

تاریخ ممتاز:۔ واجد علی شاہ کے خطوط کا یہ مجموعہ ۴۰ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر ورق پر ۷ سطور ہیں حاشیہ مذہب ہے اور خوب صورت گل کاری کی گئی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کے لئے لکھی گئی۔ واجد علی شاہ کا آخری خط اس میں

---

[۱] مثنوی حزن اختر مرتبہ خسر ص ۷۵۔ [۲] تاریخ ممتاز مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر اردو مرکز لاہور ص ۱۳
[۳] تاریخ غزالہ مرتبہ وصی بلگرامی۔ مطبع مفید عام آگرہ

شامل ہے۔ اس کی تاریخ کتابت، صفر ۱۲۷۶ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۸۶۰ء ہے[1]۔ مخطوطے کا سن تدوین بھی ۱۲۷۶ھ ہے[2]۔ ڈاکٹر محمد باقر کے بقول :-

"مکمل مخطوطہ ایک طویل تمہید اور خطوط کے دو مجموعوں پر مشتمل ہے۔ تمہید اکبر علی خاں المتخلص بہ توقیر کی لکھی ہے[3]۔"

اتفاق سے واجد علی شاہ کی بیگم نے ان خطوط کی ترتیب و تدوین کا حکم دیا تو اسی وقت تاجدار اودھ نے بھی فورٹ ولیم کلکتہ سے اس خواہش کا اظہار کیا اور مجموعہ کا نام "تاریخ ممتاز" رکھنے کی خواہش ظاہر کی[4]۔ ظاہر ہے کہ ان کی بیگم نے بادشاہ کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان خطوط کو ایک تقطیع پر مصلا و مذہب حاشیہ کے ساتھ لکھوایا اور "تاریخ ممتاز" نام رکھا۔ تاریخ ممتاز کے پہلے حصہ میں نو خطوط ہیں۔ جو آزادی کے دوران لکھے گئے۔ اس وقت واجد علی شاہ راجہ بردوان کی کوٹھی میں مقیم تھے[5]۔ یہاں وہ ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء کو پہنچے تھے[6]۔ پہلا خط ۵ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ (۹ جولائی ۱۸۵۶ء) کو لکھا[7]۔ اس مجموعہ کا آخری خط بھی اسی کوٹھی (جسے مٹیا برج بھی کہتے ہیں) سے ۱۵ صفر ۱۲۷۳ھ (۱۵ اکتوبر ۱۸۵۶ء) کو لکھا گیا ہے[8]۔ یہ تمام خطوط واجد علی شاہ نے خود لکھے ہیں۔ واجد علی شاہ کلکتہ پہنچ کر بیمار ہو گئے تھے۔ لندن نہیں گئے۔ مٹیا برج میں علالت کا زمانہ بسر ہوا، ایک سال بعد شفا ہوئی جس دن غسل صحت تھا اسی دن ولیم فورٹ جانے کا حکم ملا۔ دوسرا خط تقریباً دو سال کے بعد کا لکھا ہے یہ خط اس مجموعہ کے دوسرے حصہ کا پہلا خط ہے۔ اس حصہ میں بیس خط ہیں جس میں ۱۸، اسیری کے زمانہ میں تقریباً ۲ مہینوں میں اور دو خط

---

[1] تاریخ ممتاز۔ واجد علی شاہ ورق ۸ الف مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر۔ [2] ایضاً ورق ۲۲ ب۔
[3] تاریخ ممتاز۔ ورق ۲۔ [4] ایضاً ورق ۷ ب، ۲۷ الف (۱۵واں خط مورخہ ۸ جون)
[5] تاریخ ممتاز پانچواں خط ص ۲۴۔ [6] تاریخ اودھ ج ۵ ص ۲۷۳۔ [7] و [8] تاریخ ممتاز ورق ۲۵ ب و ۴۱ ب

پھر مٹیا برج سے دو مہینوں میں لکھے گئے ہیں۔ واجد علی شاہ کے بیان سے یہ تصدیق ہو جاتی ہے کہ انھوں نے تقریباً دو سال کے درمیانی عرصہ میں کوئی خط نہیں لکھا۔ لکھتے ہیں "اے جانِ عالم! کیا بیان کرے جو مصائب گزرے۔ بارہ آدمیوں سے قلعہ کلکتہ میں اٹھارہ مہینوں سے ہوں"[۱]

واجد علی شاہ، ۲ ذوالحجہ ۱۲۷۵ھ (۹ جولائی ۱۸۵۹ء) کو مٹیا برج سے رہا ہوئے اس کی خبر وہ ۱۹ ویں خط میں ۱۴ ذوالحجہ ۱۲۷۵ھ (۱۶ جولائی ۱۸۵۹ء) کو دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ تمھاری دعائے قلبی قبول ہوئی۔ مسرت جاوید حصول ہوئی یعنی ذوالحجہ کی ۲ ویں تاریخ ہفتہ کے دن بلائے ناگہانی آفت آسمانی سے نجات پاکر فرودگاہ قدیم میں آئے"[۲]

دوسرے حصہ کے کچھ خطوط انھوں نے چند مصاحبین سے لکھوائے۔ واجد علی شاہ یہ خطوط کیسے بھیجتے تھے، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اسیری کے زمانہ میں ان کی ڈاک انگریزوں کے وسیلہ سے آتی تھی۔ بہر حال کافی دقت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"قاصد بہت کم یاب ہیں کہ جن کے ہاتھوں دردِ دل لکھ کر بھیجا کروں۔ اگر کوئی ڈاکیہ نصیبوں سے ہاتھ آگیا تو ہزار ہزار منت اور سماجت سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ایک آدھا خط روانہ کیا۔"[۳]

واجد علی شاہ نے ان خطوط میں بڑے جوہر دکھائے ہیں ہر خط میں نئے نئے خطابات تجویز کیے ہیں۔ یوں تو ایک چاہنے والے خاوند کی طرف سے ایک محبوب بیوی کو لکھے ہوئے خطوط میں یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی لیکن لسانی اعتبار سے یہ امر کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ واجد علی شاہ کو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی کہ ہر بار

---

[۱] تاریخ ممتاز ورق ۱۴ ب

[۲] و [۳] تاریخ ممتاز ورق ۲۲ الف و ۴۲ الف

ہر موقع پر نئے نئے القابات و خطابات لکھے ہیں۔ مثلاً افسر فرق جلیل، تاج فرق بھوپال، ماہ شب چہاردہ، مایہ نشاط، باعث انبساط، خط زندگانی، میوہ باغ جوانی، لالہ رُخا، سمن سرا، سرو قد، سرو چمنستانِ یک جہتی، طوطی شکرستان خوش خلقی، گل گلزار خوبی، مہروش وغیرہ۔ اسی طرح محاورات کا برجستہ استعمال بھی خوب ہے۔ کلیجہ منھ کو آتا ہے صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آئے۔ وغیرہ۔

یوں تو ان خطوط میں ہر طرح کے جذبات ملتے ہیں لیکن نمایاں ترین مقام ذوق شوق و محبت کے اظہار کا ہے۔ ان خطوط میں محبت آمیز الفاظ کو جس کثرت سے استعمال کیا گیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خط ملاحظہ ہو:

"میرا جی چاہتا ہے کہ تمھارے عشق کا مزا اس کی زبانی سنوں وجد میں آ آکر اس کا مزا اٹھاؤں، سر دھنوں، کچھ بات نہیں، کچھ ایسی بڑی کرامات نہیں، ہماری خوشی اس کا کام ہوگا تمھارے عشق اور ہمارے حسن کا نام ہوگا۔"[1]

مثنوی حزن اختر

واجد علی شاہ کی تصانیف میں یہ مثنوی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے اپنی اسیری کے حالات و واقعات لکھے ہیں۔ تمہید میں اپنے قید خانہ کی تکلیف اور نگراں کرنل کو نیا کی تعریف بیان کی ہے۔ اس کے بعد مثنوی کے چند عنوانات یہ ہیں:

(۱) در صفت ضعف خود در قید خانہ

(۲) در صفت بیت الخلا ہائے قید خانہ

(۳) در صفت حشرات الارض

(۴) شروع داستان از انتزاع سلطنت و ہجرت۔

(۵) گفتار در طلب منور الدولہ بہادر مرحوم

---

[1] تاریخ ممتاز ورق ۶۷-۶۸

(۶) گفتار در آمدن علی نقی خاں و روانہ شدن علی احمد خاں

(۷) گفتار در شنیدن خبر بلوائے مفسداں و اظہار حال خود و شفا یافتن و جشن غسل صحت نمودن

(۸) گفتار در آمدن فوج انگریزی بنابر گرفتاری راقم التاریخ حاضر ماندند

(۹) احوال تبدیل شدن زنداں

مولانا عبد الحلیم شرر جو واجد علی شاہ کے ہم عصر تھے اور جن کا بیان ہے کہ "میرا بچپن اور نیز شباب کا ابتدائی زمانہ مٹیا برج میں اور خاص بادشاہ جہاں پناہ کے سایہ عاطفت میں بسر ہوا ہے۔"[۱] مثنوی حزن اختر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ مثنوی آج سے ۶۵ برس قبل ۱۲۶۶ھ میں جب کہ بادشاہ قید فرنگ میں تھے تصنیف ہوئی اور اس کے کئی سال بعد یعنی ۱۲۷۶ھ میں خود ظل اللہ جہاں کے مطبع واقع مٹیا برج میں چھپ کر اہل دربار اور ملازمین میں تقسیم ہو گئی۔"[۲]

واجد علی شاہ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی کوئی مصرعہ غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو اور یہ ان کی کمال موزونی طبع کی دلیل ہے ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کا کلام برا بھلا جو کچھ ہے خاص ان کا ہے اس میں ایک حرف بھی کسی کا نہیں۔ بادشاہوں کے ہاں عموماً صاحب کمال شعراء مصنفین ملازم ہوا کرتے ہیں، اور انھیں کا کلام ان شہر یاروں کے نام سے شائع ہوا کرتا ہے برخلاف اس کے واجد علی شاہ کی تصانیف میں رطب و یابس جو کچھ ہے ان کا ہے۔

---

[۱] و [۲] مقدمہ مثنوی حزن اختر مرتبہ عبد الحلیم شرر ص ۳، ۵، ۷

نظم و نثر کا دربار میں اس قدر چرچا تھا کہ تحریر در کنار گفتگو میں بھی مجال نہ تھی کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف محاورہ لفظ نکل جائے۔[1]"

عبد الحلیم شرر کے بہ قول۔ "واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دراصل ان میں دو ہی ذوق تھے۔ ایک ادب و شاعری کا اور دوسرا موسیقی کا۔ اس کے سوا کسی چیز کا شوق ان میں نظر نہیں آتا۔ ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے تو عالم نہ تھے۔ مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابو الفضل سے کچھ کم ہی ہو گا۔ میز پر بیٹھنے کی عادت نہ تھی اور نہ لکھنے کی قدیم نشست کو برداشت کر سکتے تھے لیٹ جاتے اور لکھنا شروع کر دیتے تو دم بھر میں دو دو چار چار بند کی نثریں لکھ ڈالتے..... یہی حال نظم کا تھا طبیعت اس قدر موزوں پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا گیا ہو گا۔[2]"

واجد علی شاہ نے اپنی تصانیف کی تعداد خود اپنی تصنیف 'بنی' میں ۴۶ بتائی ہے ان میں بعض تصانیف کئی جلدوں پر مشتمل ہے جن سے تعداد ۵۰ سے اوپر ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۔" یہ سب فقیر کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور جو تزلزل سلطنت اور غارت بد معاشاں میں تاراج ہوئیں وہ خارج از حساب ہیں"۔ اس کتاب کی تصنیف کے بعد وہ ۱۵ برس زندہ رہے۔ اس عرصہ میں جو کچھ لکھا وہ شامل نہیں۔ ان تصانیف میں بیشتر نایاب ہیں۔

" سلطان عالم واجد علی شاہ نے اس مثنوی (مثنوی حزن اختر) کی اشاعت کی ایک مدت دراز کے بعد ۱۳۰۵ھ میں سفر آخرت فرمایا۔ اس وقت مٹیا برج میں ان کے محلات اور ملازمین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور مٹیا برج اردو شاعری اور ہندوستانی مذاق معاشرت کا ایک اعلیٰ مرکز قرار دیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

---

[1] واجد علی شاہ۔ مقدمہ مثنوی حزن اختر۔ از شرر، نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۴ء ص ۱۵۔

بادشاہ کی زندگی کا کتنا بڑا حصہ اس مثنوی کی تصنیف کے بعد کا باقی ہے جو اس مثنوی میں مذکور نہیں ہے[1]

مثنوی کے ان چند اشعار سے قید میں واجد علی شاہ کی ذہنی اور جذباتی حالت، بے چینی، بے بسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

اقتباس مثنوی حزن اختر

مہینوں سے ہوں طالب وصل یار — نہ زنداں میں پہنچی نسیم بہار
نہ آتی ہے جاں نے نکلتا ہے دم — جگر ہو گئی رنج سے چشم نم
نہ تسکیں کو ہے پرتو آفتاب — تماشے کو آتا نہیں ماہتاب
ہوا بھی جو آتی ہے تو سہمگیں — نہ یاور نہ مونس نہ کوئی قریں
رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے — سبھوں نے کنویں میں ڈھکیلا مجھے

ساقی نامہ دحال بے وفائی مطلوب السلطان نواب خجستہ محل صاحبہ کربلائی:

لگا میرے سینے سے مینے کو تو — نجل کر اس آب گینے کو تو
دمادم سے ارغوانی پلا — نہ ہو سرخ تو زعفرانی پلا
ملا ہونٹ ساقی ذرا رحم کر — نہ دادے کہ مستوں کو ہووے خبر
جھکوں تیرے آگے جبین نیاز — ذرا چھیڑ مطرب تو آہنگ ساز
صدا دے کہ مستو چلو شہر سے — یہ قند مکرر بیو زہر سے
دب کر نہ زندوں سے تو ساقیا — نہ کر رند مے نوش کو بے مزا

صدا دے مغنی کو اے غم گسار
کہاں ہے ذرا لائے اس جا ستار

---

[1] مقدمہ مثنوی حزن اختر، ص ۹۰

قید خانہ کا حال

سوا اپنے سائے کے کوئی نہیں — ہوا ابھی نہیں، میرے تن کے قریں
ہوا تک نہیں قید خانہ میں آہ — ہوا بے گنہ قید میں بادشاہ
مگر غم نہیں ساقیا کیا ہوا — غلامِ علی کو نہیں ڈر ذرا
کسی کی محبت کو پایا نہ ٹھیک — محبت کو دیکھا بت امرد کیک
رہے سو برس گر فدا اک پر — وہ دم بھر نہ لیوے گا اس کی خبر
عجب ہے یہ نیرنگِ دنیائے دوں — زبوں ہے، زبوں ہے، زبوں ہے، زبوں
فقط نام شاہی سے ہوں میں خراب — کہاں میں کہاں قید کیسا عذاب
اٹھاتا ہوں قرآں نہیں ہے یقیں — کروں کس سے فریاد میں دل حزیں
دل زار ہونٹوں پہ آ آگیا — میں گھبرا گیا سخت گھبرا گیا
الٰہی مجھے قید سے دے نجات — نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات

بس اب الحذر الحذر اے خدا
کر اس اخترِ زار کو تو رہا

مفتی صدر الدین آزردہ

آزردہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں علی مصیبتوں اور بعد میں جنھیں شوق جہاد یا شرکت جہاد کی وجہ سے طرح طرح کے مصائب جھیلنے پڑے۔

مفتی صدر الدین آزردہ خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت چراغ ہے۔ مولانا فضل امام، شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا فضل حق کے ہم سبق تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے فارسی خط میں ان کا شمار دہلی کے فضلائے نامدار میں کیا ہے۔ عربی، فارسی اور ریختہ پر انھیں پورا عبور حاصل تھا۔ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کا ذکر اس شعر سے شروع کیا ہے۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است[۱]

غالب ۱۸۵۷ء کے بعد میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دلی کہاں، ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود، مطرود، محروم و مغموم۔"

مصطفیٰ خاں نواب شیفتہ ہیں، صدر الدین یہی صدر الدین آزردہ جن کے

علم و کمال اور سخن دانی و سخن فہمی نے دھوم مچا رکھی تھی۔

انقلاب سے پہلے مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے اور اس زمانہ میں یہ اعلیٰ عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ علم سے اتنا لگاؤ تھا کہ جب عدالت کے کام سے فرصت ملتی طلبا کو درس دیتے۔ ان کے سلسلۂ تلامذہ میں سرسید، نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور، جیسے لوگ ہیں۔ انھیں فکر شعر سے بھی لگاؤ تھا۔ فارسی اور ریختہ یعنی اردو دونوں میں شعر کہتے۔ اول اول شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے بعد میں میر ممنون کو استاد مقرر کیا۔ دلی اجڑنے سے پہلے شاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ غالب، شیفتہ، صہبائی اور دوسرے شاعروں کے علاوہ خود ان کے دم سے دلی کی رونق تھی۔ غالب، آزردہ کے بہت معتقد تھے ایک قصیدہ ان کی شان میں کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں:

صدر الدین دو دولت و صدر الصدور روزگار
میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائی من

گویم واز نکتہ چیناں در دلم نبود ہراس
کیقباد و قیصر و کیخسرو و دارائی من

شیفتہ نے بھی ان کے علم و فضل کی خوب تعریف کی ہے انھیں "ملک ملک بیان و معانی فرماں فرمائی قلم رو سخندانی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ نہ تو آزردہ کا دیوان ملتا ہے نہ تذکرہ شعرائے ریختہ، مختلف تذکروں سے ان کے فارسی اور اردو کلام کے کچھ اشعار مل جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آزردہ کے لئے دامن بچانا مشکل تھا۔ وہ فتویٰ دینے میں پیش پیش تھے۔ ان کے خلاف جرم تو ثابت نہ ہو سکا اس لئے انھیں کڑی سزا تو نہیں ملی لیکن چین سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ مرزا غالب کے ایک خط سے ان حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے:

"حضرت صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے

کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ امداد ان کے لئے کافی ہے اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپے مہینے کی آمدنی ضعف پیری نے گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثانیہ کے اواخر میں ہیں خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔[۱]

مفتی صاحب جیل میں رکھے گئے تھے، مولانا نذیر حسین محدث، مولوی عبدالقادر وغیرہ بھی قید ہوئے۔ مگر مسٹر منس کی سفارش سے رہائی مل گئی۔ مفتی صاحب نے قید میں بیٹھے بیٹھے ایک ترکیب بند لکھ ڈالا۔

آ پھنسے بے ڈھب الٰہی دیکھئے کیسی بنے
مر رہے ہیں سب الٰہی دیکھئے کیسی بنے

مولف خم خانہ جاوید لکھتے ہیں:

"غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ بھی مختلف مصائب اور دقتوں میں پھنس گئے تھے۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں کچھ روز حوالات میں بند رہے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ایک ترکیب بند لکھ ڈالا جس کا ایک شعر یہ ہے:

آ پھنسے بے ڈھب الٰہی دیکھئے کیسی بنے
مر رہے ہیں سب الٰہی دیکھئے کیسی بنے"[۲]

آزردہ کا آخری زمانہ نہایت پریشانی میں گزرا اس کا اندازہ ان غیر مطبوعہ خطوط سے ہوتا ہے جو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں پروفیسر خواجہ احمد صاحب فاروقی

---

[۱] خط بنام حکیم احمد حسن دسمبر ۱۸۶۳ء اردوئے معلیٰ طبع لاہور ص ۱۸۰

[۲] ج ۱، ص ۵۴

نے پیش کئے تھے۔ اسی زمانہ میں آزردہ نے دلّی پر ایک مرثیہ بھی لکھا جس میں حسرت بھرے انداز میں پرانے رفیقوں کا ذکر کیا ہے :۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر اور جان پہ بن آتی ہے
مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

آزردہ کا انجام آخر جس دردناک صورت میں ہوا اس کا اندازہ خود ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مرنے سے ایک دن قبل والی رام پور کو لکھا تھا۔

"شکر الطاف والا میری طاقت سے فزوں ہے، حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہرزادہ ان دونو کو آپ کے سپرد کیے جاتا ہوں اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا۔"[1]

آزردہ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (۱۶ر جولائی سنہ ۶۸ء) کو ہوا۔ چراغ الم، سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

---

[1] آزردہ۔ از شکور احسن (حسن ستادن میری نظر میں مرتبہ ناصر کاظمی انتظار حسین) ص ۲۶۹

شیفتہ دہلوی

عظیم الدولہ سرفراز الملک مصطفٰے خاں شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے ان کے والد نواب مرتضٰی خاں بہادر جنگ جہاں گیر آباد کے رئیس تھے اور والدہ مرزا اسمٰعیل بیگ ہمدانی، مشہور سپہ سالار کی بیٹی اور احتشام الدولہ ہمدانی کی نواسی تھیں۔ انھوں نے ماں باپ کے زیر سایہ تعلیم پائی۔ فارسی، عربی اور علوم مروجہ کی تعلیم میاں جی مال مال دہلوی سے پائی۔ حدیث اور قرآن میں مولانا نور محمد دہلوی نقش بندی، شیخ عبداللہ سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ مولوی کرام اللہ محدث سے بھی بعض علوم پڑھے۔ سرسید آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:

"مسند آرائے جاہ و جلال و مکتسب اقبال عمدہ ارکین دولت اسوۂ اساطین حشمت صاحب مرتبت عالی مہبط انور سعادت ازلی، مورد انظار مراحم لم یزلی۔ نبض شناس شخص سخن فہمی و سخن دانی، قانون دان پژوہش نکتہ سنجی و نکتہ دانی حاتم کرم عطارد رقم رستم تواں نواب محمد مصطفٰے خاں بہادر"[۱]

مصطفٰے خاں ریختہ میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص فرماتے تھے۔

سیاسی زندگی:-

نواب اپنے عہد کے ملک و دولت کے بہی خواہ تھے، مگر قوم کی قسمت بگڑ چکی تھی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی کمپنی کے حکام نے جو طریقہ اختیار کیا وہ اہل ہندوستان کے لئے سخت ناگواری کا باعث تھا۔ جاگیروں کی ضبطی نے ارباب دولت و جاگیر میں بے چینی کی لہر دوڑا دی تھی۔ اور ہنگامہ دار و گیر میں جاگیردار، بادشاہ دہلی کے ہم نوا ہو گئے تھے

نواب شیفتہ کے ہم رشتہ رئیسوں نے شیفتہ کو میر کارواں بنایا اور متحد ہو گئے۔ رؤسا میں سب سے بڑی شخصیت ولی داد کی تھی ان کے پرچم تلے 'اتحاد' کے عملی مجاہد جمع ہوئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء برپا ہونے پر ولی داد خاں نے اپنے علاقہ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ مگر نتیجہ برعکس نکلا۔ انگریزوں کے قبضہ ہونے کے بعد انھیں باغی ٹھہرایا گیا کسی کو حبس دوام ہوئی۔ کوئی ۷ برس کے لئے قید ہوا۔ شیفتہ کو بھی ۷ برس کی قید فرنگ ہوئی۔ نواب صدیق حسن بہادر نے بڑی کوششوں سے رہا کرا دیا۔ اس قید کے دوران شیفتہ نے کیا کچھ کہا اور کیا لکھا اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ یکم شعبان ۱۲۷۳ھ کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے میر مومن علی خاں صدر الصدور ساکن سندیلہ کو ایک سفارش نامہ لکھا اور بڑی جد و جہد کے بعد ان کی نصف جاگیر واگذاشت ہوئی۔

۶۳ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں بمقام دہلی وفات پائی درگاہ نظام الدینؒ میں دفن ہوئے۔

باب پنجم

اختتامیہ

زندانی ادب کا جائزہ
اہمیت و افادیت

اختتامیہ

انیسویں صدی بالخصوص ۱۸۵۷ء میں قید و بند کا شکار ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے اس جائزے اور تذکرے سے چند حقائق سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کم و بیش یہ تمام ادیب، کمپنی یا تاج برطانیہ کی غیر ملکی حکومت کے اسیر ہوئے، اور بر استثنائے چند، ان سب کا مشترکہ جرم یہ تھا کہ انھوں نے ایک غیر قوم کے بڑھتے ہوئے جابرانہ اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکایا، اس کے آلۂ کار نہیں بنے یا اس سے سرکشی کی۔ ان ادیبوں نے "حق گوئی" و بے باکی، کو اپنا شعار بنایا، اور مصلحت پسندی کی قربان گاہ پر سب کچھ بھینٹ چڑھانے سے گریز کیا۔ ان ادیبوں میں ہر طبقہ، ہر مرتبہ کے ادیب تھے، ان میں حکمراں بھی تھے، زمیندار بھی، حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار بھی۔ نامور ثقہ علماء بھی اور آزاد منش شاعر بھی۔ لیکن یہ سب برطانوی حکومت کی چیرہ دستیوں سے بیزار اور برہم تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بیشتر کا سیاسی شعور زیادہ بالیدہ اور بلند نہیں تھا۔ وہ برطانوی تسلط کے سامراجی مقاصد سے زیادہ باخبر نہیں تھے اور انگریزوں کی پیچیدہ سیاسی چالوں کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کے باوصف وہ انگریزوں کی غلامی اور سوداگروں کے بھیس میں ان کے غاصبانہ تسلط کو کسی نہ کسی عنوان سے ملک و قوم کے لئے مضر اور مہلک خیال کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں سے نفرت یا بغاوت کے پس پردہ کچھ ذاتی محرکات بھی کام کر رہے ہوں گے اور بعضوں کو انگریزوں کے ہاتھوں اپنی حکومت، ملکیت، پنشن یا عہدے کے چھن جانے کا صدمہ

ہوگا۔ مبض کو عیسائیت کی تبلیغ اور ہندستانی مذاہب کے خلاف انگریز مشنریوں کی زہرافشانی پر غم وغصہ ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی بےزاری میں اجتماعی بےزاری کا احساس اور عکس شامل نہیں تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانے میں اور اس کے بعد ملک کا ہر انسان بالخصوص حساس اور خوددار ادیب وشاعر اپنے آپ کو قید وبند کی حالت میں محسوس کرتا تھا عہد غلامی میں رہنے والے ایک قوم پرست اور باشعور انسان کی نفسیات، قید وبند کی نفسیات سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی چنانچہ اس دور کے ان ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات میں بھی جو کسی قید خانہ میں اسیر نہیں رہے، انگریزوں کی غلامی یا اسیری کا احساس مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہوا ہے۔

بہر حال اس وقت اصطلاحی مفہوم میں قید وبند کی زندگی گزارنے والے ادیب شاعر ہی ہمارا موضوع ہیں۔ قید کی حالت میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آتی ہے اور اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ (زندانی شاعر وادیب) جس قوم یا حکومت کی قید میں تھے اس کے خلاف کھلے الفاظ میں اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اہل وطن پر غیر ملکی حکمرانوں نے جو ظلم وتشدد روا رکھا تھا، قید کی حالت میں اس کے خلاف بھی غم وغصہ کا اظہار کرنا ممکن نہیں تھا۔ گویا ملک کے اجتماعی اور سیاسی حالات کے بارے میں سچائی سے کچھ لکھنا اپنی قید کی میعاد میں اضافہ، صعوبتوں اور پریشانیوں کو بڑھانا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی پابندیوں، مجبوریوں اور معذوریوں کو بہر حال پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تاہم اشاروں، کنایوں میں یا ان کی تحریروں کے بین السطور میں انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت کو پڑھا جا سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر جیسا مجبور و بےکس انسان یہ کہنے پر مجبور نظر آتا ہے:

نہیں حال دہلی سنانے کے قابل	یہ قصہ ہے رونے رُلانے کے قابل
اجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اس کے	جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفرؔ ہے	فقط حال دہلی سنانے کے قابل

اس غزل میں اس درد کی کیسی سچی تصویر نظر آتی ہے:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا سینہ غم سے فگار ہے
یہ تھا شہر دلی یہ تھا اک چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
دے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

اسیری کی حالت میں ان ادیبوں اور شاعروں نے جو کچھ لکھا ہے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(آ) علمی، لسانی، یا مذہبی تصانیف
(ب) فارسی اور عربی کتب کے تراجم
(ج) روزنامچہ یا مکاتیب
(د) شعر و شاعری

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی بھی تصنیف و تالیف کی زبان اور ذریعہ اظہار تھی۔ اہل علم حضرات علمی مسائل پر اکثر فارسی میں ہی لکھتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ جزائر انڈمان اور نکوبار کے اکثر ادیبوں نے فارسی زبان میں تصنیفی کام کئے۔ ان کے روزنامچے بے شک ان کی اسیری کی زندگی اور ذہن کو سمجھنے کا اہم وسیلہ ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر تصانیف فارسی میں ہیں بعض شعراء (مثلاً فضل حق) نے شاعری بھی عربی یا فارسی (مثلاً غالب کا جیسے) زبان میں کی ہے، لیکن اردو میں بھی ان کے اشعار کی معقول تعداد ملتی ہے۔

شاعری ایک تخلیقی ہنر کی صورت میں شخصی تجربات اور احساسات کے اظہار کا

ذریعہ ہے۔ تنہائی اور ذاتی غم واندوہ کی حالت میں خصوصاً جب سماجی زندگی سے اس کا تعلق منقطع ہوگیا ہو شاعر کچھ اور داخلیت پسند ہوجاتا ہے اور اپنی قلبی واردات کو پوری شدت اور شخصیت کے ساتھ لفظوں میں ادا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایام اسیری کے کلام میں شعراء کی ذاتی کلفتوں، اذیتوں اور محرومیوں کا بیان ہی زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ـــ مثلاً

سوا اپنے سائے کے کوئی نہیں   ہوا بھی نہیں رود تن کے قریں
ہوا تک نہیں قید خانہ میں آہ   ہوا بے گناہ قید میں بادشاہ
عجب ہے یہ نیرنگ دنیائے دوں   زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے زبوں
فقط نام شاہی سے ہوں میں خراب   کہاں میں کہاں قید کیسا عذاب

دل زار ہونٹوں پہ آ آگیا
میں گھبرا گیا، سخت گھبرا گیا

واجد علی شاہ کے ان اشعار میں ہر اسیرِ فرنگ کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تنہائی و بے گناہی، وحشت اور باطنی کرب کا آسیبی احساس ہر اسیر کا مقدر تھا۔

ایک دوسرا عنصر جو دورِ اسیری کی شاعری میں مشترک نظر آتا ہے اپنے ماضی کی زندگی کے بارے میں ایک طرح کا Nostelgic احساس ہے، ماضی کی طرف لوٹنا یا ماضی کی یادوں کے سہارے جینا، حال اور مستقبل سے بے اطمینانی یا بے زاری کی علامت ہوتا ہے۔ ان شعراء کی دکھ بھری اور بے رنگ تنہائی کا سب سے قیمتی سہارا ماضی کی حسین یادیں تھیں۔ چنانچہ ان کے کلام میں ماضی کے بیتے ہوئے ایام، آسائشوں، احباب، عزیزوں اور محبوباؤں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس طرح وہ تصور کی دنیا میں زمان ومکان کی طنابیں کاٹ کر خارجی زندگی سے اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں اس طرح تنہائی کا احساس مٹا کر جینے کا ولولہ اور حوصلہ پاتے ہیں:

مہینوں سے ہوں طالبِ وصلِ یار   نہ زنداں میں پہنچی نسیم بہار
نہ آتی ہے جاں نہ نکلتا ہے دم   حجر ہو گئی رنج سے چشم نم

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے سبھوں نے کنویں میں ڈھکیلا مجھے

....

لگا میرے سینے سے سینے کو تو تجلی کر اس آبگینے کو تو
دم دفاع ادغوانی بلا نہ ہو سرخ تو زعفرانی بلا
ملا ہونٹھ ساقی ذرا رحم کر نہ دے کہ مستوں کو ہو دے خبر

دورِ اسیری کی شاعری میں ایک دوسرا پہلو جو نمایاں نظر آتا ہے، مذہبی اور روحانی انہماک یا عقیدت کا رجحان ہے۔ جب اسیری کی ناقابلِ برداشت صعوبتوں سے نجات پانے کا کوئی سہارا یا مادی وسیلہ سامنے نہ ہو تو دست گیری یا مشکل کشائی کے لئے قادرِ مطلق یا خدا کی ذات سے لو لگانا ایک فطری امر تھا۔ اس لیے بھی کہ عبادت اور ایمان کی پختگی سے صبر اور برداشت کی طاقت پیدا ہوتی ہے اور غموں اور مصیبتوں میں پست ہمتی کے بجائے حوصلہ مندی، عالی ظرفی اور استواری آتی ہے۔ خدا، پیغمبر اور روحانی مرشدوں کا سہارا آخری سہارا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان شعراء کے کلام میں مذہبی عقیدت اور روحانی اکابرین کا ذکر بار بار آتا ہے۔

الٰہی مجھے قید سے دے نجات نکلتی نہیں غم سے اب منھ سے بات
بس اب الحذر الحذر اے خدا کر اس اختر زار کو تو رہا

بیاں

قسم ہے تجھے اے نسیم سحر مری بے کسی پہ ذرا رحم کر
میسر نہیں کوئی پیغام بر مدینے میں ہو دے جو تیرا گزر
تو میری طرف سے زمیں چوم کر یہ کہنا بدرگاہِ خیر البشرؐ

نبی الوری یا نبی الوری

بہ بیکس حالِ ما یا نبی الوریٰ ـــــ سید احمد بریلوی

بیاں جس روز سے دخل بے بسی نے پایا ہونٹوں کا نہ قرب ہنسی نے پایا
اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیر ڈھونڈا تو مجھی کو بے بسی نے پایا

کم و بیش یہی تمام اوصاف و عناصر نثری تحریروں، مکاتیب، روزناموں میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان میں روزمرہ کی زندگی کے تجربات کچھ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں پچھلے اوراق میں دی جاچکی ہیں

یہ اتفاق ہے کہ غالب اور منیر اور ایک حد تک ظفر کے علاوہ اس دور میں جن شعراء نے اسیری کی زندگی گزاری ہے وہ معمولی درجہ کی تخلیقی اور شعری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لیے مجموعی طور پر اس عہد کی جسیاتی شاعری کی فنی قدر و قیمت زیادہ بلند نہیں۔ غالب کی فارسی نظم کا ذکر آچکا ہے۔ ظفر کے چند اشعار کے علاوہ ان کے عہد اسیری کے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ منیر شکوہ آبادی نے البتہ اسیری کے تجربات اور حالات کو زیادہ مؤثر اور حسن کارانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان کی رباعیوں اور نظموں میں تاثیر ہے اور ان کا کلام آج بھی دلوں کو متاثر کرتا ہے۔

باقی شعراء کے کلام میں کہیں کہیں جذبہ کی شدت نے ایک تاثر پیدا کر دیا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے کلام میں معیار زیادہ بلند نہیں۔ اس کا سبب قید و بند کا وہ پریشان کن اور تکلیف دہ ماحول تھا، جس میں ذہنی اور دماغی اور جسمانی و روحانی یکسوئی حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی، پراگندہ دنوں نے فکر جمیل خواب پریشاں بنی رہی، لیکن ادبی ذوق، شعر و سخن سے لگاؤ اور طبیعت کی موزونی نے انھیں تمام دشواریوں، مصیبتوں اور دقتوں کے باوجود جب بھی موقع ملا اپنے احساسات و خیالات کو اظہار کرنے کا حوصلہ عطا فرمایا اور نظم و نثر دونوں میں انھوں نے آپ بیتی بھی لکھی اور جگ بیتی بھی۔ زنداں کے مشاہدات و مصائب کا بھی ذکر کیا اور غیر ملکی جبر و تشدد سے نجات پانے کے اشارے بھی دیے۔ کہیں انھوں نے ایسے خیالات نظم کیے جو ان کے حسب حال تھے لیکن ان میں ادبی محاسن کم تھے۔ اور کہیں مثنوی کے انداز میں بیانیہ اسلوب میں اظہار خیال کیا ہے کہیں نعت و منقبت کے پیرایہ میں اپنا درد دل بیان کیا ہے۔

"دبستان لکھنؤ" کے شعراء نے زبان و بیان کے اعتبار سے لکھنوی خصوصیات قائم رکھیں، ان کے کلام میں رعایت لفظی کی وجہ سے کہیں کہیں تصنع پیدا ہو گیا ہے، خیالات

بھی بلند نہیں ہیں، انداز بیان ضرور دل کش ہے۔ اسی طرح ان کی نثر بھی رنگین، مسجع اور مقفیٰ ہے، حالانکہ اردو نثر اس تصنع اور تکلف کو خیر باد کہہ چکی تھی، لیکن لکھنؤ اس کو سینہ سے لگائے ہوئے تھا اور "علمیت و قابلیت" کا معیار سمجھتا تھا۔ آسان نثر لکھنا اس کے نزدیک علمی و ادبی بے مائگی تھی۔

دراصل ۱۸۵۷ء کے عہد اسیری کی یہ تحریریں، اردو ادب میں جیسانی ادب کا پہلا اگر روشن باب ہے اس نے مستقبل کے لئے رہنمائی کا کام کیا ہے، اور اپنے بعد کم و بیش نوّے سال کی برطانوی حکومت کے دور میں اردو کے جن بے شمار ادیبوں اور فن کاروں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں ان کو چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن جاری رکھنے اور لوح و قلم کی پرورش کرتے رہنے کا عزم و حوصلہ عطا فرمایا ہے۔ ان میں اردو ادب کی مایہ ناز ہستیاں بھی تھیں اور صلاحیت رکھنے والی ایسی اعلیٰ شخصیتیں بھی تھیں جو بلند پایہ مدبّر و مفکر ہوتے ہوئے بھی "ادبی ذوق" رکھتی تھیں۔ ان حضرات نے قید خانوں میں جو کچھ لکھا وہ نہ صرف اعلیٰ ادب کی میزان پر پورا اترتا ہے بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ان سب حضرات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر انیسویں صدی کے زندانی ادب سے ہی روشنی اور رہنمائی ملی۔

کتابیات

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ
۱	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	سنہ ۱۹۵۶ء
۲	ادب اور سماج	سید احتشام حسین	سنہ ۱۹۴۸ء
۳	آثارالصنادید	سر سید احمد خاں	سنہ ۱۹۶۱ء
۴	اٹھارہ سو ستاون کے اخبارات و دستاویزیں ۔ محمد عتیق مکتبہ شاہراہ دہلی		سنہ ۱۹۶۶ء
۵	اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد	غلام رسول مہر	سنہ ۱۹۵۷ء
۶	اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعراء	امداد صابری	سنہ ۱۹۵۹ء
۷	اٹھارہ سو ستاون کے باغی شعراء	"	سنہ ۱۹۶۰ء
۸	الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) مولانا فضل حق مرتبہ شاہد خاں شیروانی		سنہ ۱۹۴۷ء
۹	اردو (سہ ماہی) کراچی	شمارہ جنوری	سنہ ۱۹۶۸ء
۱۰	استاد العلماء (سوانح منشی لطف اللہ علی گڑھی) مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی		سنہ ۱۹۳۷ء
۱۱	انتقادیات	نیاز فتح پوری	
۱۲	انتخاب یادگار	امیر مینائی	سنہ ۱۲۹۷ھ
۱۳	انسائیکلوپیڈیا برٹینکا	جلد اول	سنہ ۱۹۵۵ء
۱۴	اہل ہند کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر تارا چند	
۱۵	آئینۂ غالب	پبلی کیشن ڈویژن دہلی	سنہ ۱۹۶۲ء
۱۶	ایسٹ انڈیا کمپنی کے باغی علماء	انتظام اللہ شہابی	
۱۷	بہادر شاہ ظفر	مفتی امیر احمد علوی	سنہ ۱۹۵۶ء
۱۸	بہادر شاہ ظفر	رئیس احمد جعفری	
۱۹	بدایوں سنہ ۱۹۵۷ء میں	مولانا محمد سلیمان بدایونی	

۲۰	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
۲۱	تاریخ اودھ جلد V	محمد نجم الغنی خاں
۲۲	تاریخ عجیب (تاریخ پورٹ بلیر)	محمد جعفر تھانیسری
۲۳	تاریخ مشائخ چشت	پروفیسر خلیق احمد نظامی
۲۴	تواریخ عجیب (کالاپانی)	محمد جعفر تھانیسری مرتبہ محمد ایوب قادری سنہ ۱۹۶۰ء
۲۵	تاریخ شاہجہاں پور	جبیح الدین خاں
۲۶	تاریخ عہد انگلیسیہ	منشی ذکاء اللہ
۲۷	تاریخ غزالہ	وصی بلگرامی
۲۸	تاریخ ممتاز	مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر (اردو مرکز لاہور)
۲۹	تذکرہ علمائے ہند تالیف محمد رحمٰن علی ترجمہ محمد ایوب قادری (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی)	
۳۰	تذکرہ مشاہیر کاکوری	محمد علی حیدر
۳۱	تعارف تاریخ اردو	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۳۲	تقویم ہجری وعیسوی	ابوالنصر محمد احمد خالدی سنہ ۱۹۳۸ء
۳۳	تلامذہ غالب	مالک رام
۳۴	تواریخ حبیب اللہ	مفتی عنایت احمد کاکوروی طبع کانپور
۳۵	جان عالم	عبدالحلیم شرر۔ ادارہ فروغ اردو لاہور
۳۶	چراغ دہلی	مرزا حیرت دہلوی
۳۷	چند ہم عصر	مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۶۳ء
۳۸	حکومت خود اختیاری	لالہ لاجپت رائے
۳۹	خطوط غالب	مرتبہ غلام رسول مہر طبع اول
۴۰	خطوط غالب	" مالک رام
۴۱	خمخانۂ جاوید جلد اول	لالہ سری رام

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	سنہ
۴۲	دلی کا دبستان شاعری	پروفیسر نورالحسن ہاشمی	
۴۳	دہلی کا آخری سانس	خواجہ حسن نظامی	
۴۴	دیوان غالب	شرح نظامی طبع ششم	
۴۵	دیوان ظفر حصہ ۱ تا ۴	بہادر شاہ ظفر	
۴۶	ذکر غالب	مالک رام	
۴۷	سرگزشت مجاہدین	غلام رسول مہر	سنہ ۱۹۵۶ء
۴۸	سن ستاون	پنڈت سندر لال	
۴۹	سن ستاون میری نظر میں	مرتبہ ناصر کاظمی - انتظار حسین	
۵۰	شعر نو	ڈاکٹر محمد حسن	
۵۱	"صبح" دہلی شمارہ ۳، ۴	ظفر نمبر مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	سنہ ۱۹۶۳ء
۵۲	"آج کل" دہلی	ظفر نمبر	سنہ ۱۹۶۲ء
۵۳	"خیفہ تاریخ اردو	محمود اکبر آبادی	
۵۴	علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد اول، دوم، سوم	سید محمد میاں	سنہ ۱۹۵۰ء
۵۵	علم الصیغہ	مفتی عنایت احمد - مطبع مجتبائی دہلی	سنہ ۱۳۱۶ھ
۵۶	غدر کے چند علماء	مفتی انتظام اللہ شہابی	
۵۷	غالب	غلام رسول مہر	
۵۸	فوائد الناظرین دہلی		
۵۹	قند اردو	ترمیم شدہ ایڈیشن	
۶۰	قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر عابد حسین	سنہ ۱۹۵۵ء
۶۱	قیصر التواریخ جلد دوم		
۶۲	کلیات منیر شکوہ آبادی	منیر شکوہ آبادی	
۶۳	کمپنی کی حکومت		
۶۴	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	

نمبر	کتاب	مصنف / ناشر	سنہ
۶۵	مسلمانوں کے افلاس کا علاج ۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس		سنہ ۱۹۳۲ء
۶۶	مسلمانوں کا روشن مستقبل	طفیل احمد منگلوری	
۶۷	منتخب العالم	منیر شکوہ آبادی	
۶۸	منیر شکوہ آبادی ۔ حیات اور شاعری ۔	ڈاکٹر زہرہ یاسمین	
۶۹	نوائے آزادی	ادبی پبلیشرز بمبئی	
۷۰	نوائے ظفر	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	
۷۱	نوبت پنج روزہ	راشد الخیری	
۷۲	نقش آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد	
۷۳	نقش حیات	مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	
۷۴	واجد علی شاہ (مقدمہ مثنوی حزن اختر)	شرر	سنہ ۱۹۲۴ء
۷۵	واجد علی شاہ ۔ عہد اور شاعری	رئیس احمد جعفری	
۷۶	واقعات ہند	مطبوعہ سنہ ۱۸۷۵ء	
۷۷	واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول	بشیر الدین احمد	
۷۸	ہندوستانی مسلمان	مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی	
۷۹	ہمارے ہندوستانی مسلمان	ڈبلو ڈبلو ہنٹر	
۸۰	ہماری اردو	نامی پریس میرٹھ	سنہ ۱۹۳۵ء
۸۱	یادگار غالب	حالی	

اشاریہ

(مقامات)

(۱)

اشاریہ

(اشخاص)

(ب)

(م)